ابوالکلام آزاد

مرتّبہ

انور عارف

مولانا آزاد ۱۹۳۴ء میں

دہلی ۲۱ - مئی ۴۶ء

عزیزی

کچھ بھی لکھا کہ آپکے بےلوث جذبات محبت و اخلاص سے کس درجہ دل متاثر ہوا! شکر گزار تھا اور شکر گزار ہوں۔ خاطر کا ایک نسخہ مرسل ہے۔ افسوس ہے کہ پہلی چھپائی اچھی نہ ہوئی۔ اب دوبارہ مع بعض اضافوں کے زیر طباعت ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

یحییٰ اعظمی صاحب
دارالمصنفین
اعظم گڑھ

یحییٰ اعظمی کے نام

نیم باغ سرینگر کشمیر

۲۸ / ۸ / ۴۵ء

عزیزی سلمہ اللہ

اللہ تعالیٰ اس اخلاص و محبت کے لیے جزائے خیر دے۔ دعا کرتا ہوں۔ اور شکر گزار ہوں۔ علی گڑھ کے ریٹیشن پر چند کلمات کا جو طرز عمل رہا تھا، میں نے انکی نادانی پر محمول کیا اور انہیں بخش دیا۔ انکی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ ان نادانوں پر ہے جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بنائے ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام [illegible]

مولانا سید سلیمان اور دوسرے احباب سے ملوں تو میرا سلام کہیں۔ تمنا دل میں گزرتی ہے بہت جی چاہتا ہے کہ دوستوں سے ملاقات ہو لیکن تجری الریاح بما لا تشتہی السفن! . .

مولانا آزاد کے چند خطوط

کلکتہ
۲۲- مارچ ۴۶ء

عزیزی- خطوں کے جواب کا انتظار رہا- اس وقت غبار خاطر کے پروف دیکھے تو ایک غلطی اور نظر آئی- مہربانی کرکے اسے بھی غلط نامہ میں بڑھا دیجئے- صفحے کے نمبر کی ترتیب سے اسکی جگہ لگائی جائے-

صفحہ ۱۰۱- سطر ۴- "چودہ پندرہ برس سے آگے نہیں بڑھا" کی جگہ "چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا" ہونا چاہیے

والسلام علیکم

ابوالکلام

غلام رسول مہر کے نام

پنڈھا جل
۲۵- نومبر ۴۵ء

عزیزی اللہ بخش میاں و دعا فرستت

میں ۴- دسمبر تک یہاں ہوں اسکے بعد کلکتہ کا قصد ہے- پھر اس کے بعد یہاں واپس آؤنگا اگر آپ ۴- دسمبر سے پہلے آ سکتے ہیں تو آیئے- نہیں تو ۹- کے بعد- میری واپسی کی اطلاع آپکو اخبارات سے مل جائیگی آپ جب بھی مجھ سے ملینگے میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا والسلام علیکم

ابوالکلام

یحییٰ اعظمی کے نام

مولانا آزاد کے چار غیر مطبوعہ خطوط قاضی عبدالغفار کے نام

کلکتہ

۹ جون ۱۹۳۶ء

صدیق العزیز! دفتر سے ترجمان القرآن جلد دوم کا اعلان اخبارات کو بھیجا گیا تھا کہ ایک مرتبہ شائع کر دیں۔ اخبارات میرا اعلان شائع کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے دفتر سے معلوم ہوا کہ آپ کے اخبار نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ جتنی کہ اس سے خواہش کی گئی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لئے سرگرمی دکھائی یعنی عرصہ تک اعلان شائع ہوتا رہا۔

کسی اخبار میں ایک مرتبہ سے زیادہ اعلان کا نقل جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس طرز عمل میں محبت و اخلاص کی جو جھلک نظر آئی وہ یقیناً اہمیت سے خالی نہیں میں اس کے لئے شکر گزار ہوں

میں اپنی کتابیں صرف چند دوستوں اور عزیزوں کو بھیجا کرتا ہوں۔ میں نے اب اس میں ایک کا اضافہ کر لیا ہے، اور ترجمان القرآن جلد دوم کا ایک نسخہ مرسل ہے۔ امید ہے مع الخیر ہوں گے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

میں یہ اس لئے نہیں بھیج رہا ہوں کہ اخبار میں ریویو کی جائے۔ ریویو کے لئے میں اخبارات کو زحمت نہیں دیا کرتا۔ یہ شخصاً آپ کے لئے تحفہ ہے۔

عزیزی آپ نے اپنی نظموں کا جو مجموعہ
نوائے حیات کے نام سے بھیجا ہے
دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ آپ کے کلام میں تخیل
کی وسعت اور الفاظ و ترکیب کی نفاست
دونوں خوبیاں ہیں اور انہی دو عنصروں کی ترکیب
کا نام شاعری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا کلام
عام طور پر مقبول ہوگا

ابوالکلام

دہلی ۱۰ اگست ۵۷

یحییٰ اعظمی کے نام

نئی دہلی

۲۷ اکتوبر ۴۹ء

صدیقی! ایک خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا۔ جب تک مجوزہ ترمیمات کا مسودہ سامنے نہ آئے مشکل ہے کہ کوئی آخری رائے صورتِ حال کی نسبت قائم کی جا سکے۔ البتہ کانگریس کی [illegible] یہ خیال کام کر رہا ہے کہ اگر اصلاحات قابلِ قبول نہیں بنائی جا سکتیں تو پھر [illegible] ملتوی کر دیا جائے۔ یہی رائے گاندھی جی کی بھی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجوزہ ترمیمات کا مسودہ آ جائے تو پھر کوئی رائے قائم کروں اور اس سلسلے میں صحیح مشورہ دے سکوں۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں ایک معاملہ کی نسبت اشارہ کیا تھا مگر مزید غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ بہرصورت آپ اس طرح کی کوئی بات درمیان نہ چھیڑیں۔ جب آپ ملیں گے تو زبانی باتیں ہوں گی۔

والسلام

ابوالکلام

پونا

۱۳ ستمبر ۴۵ء

صدیقی!
مسٹر نائیڈو کے ذریعہ آپ کا خط وصول ہوا جس کے لئے شکر گزار ہوں

جو بات آپ نے لکھی ہے وہ میرے پیش نظر ہے اور اس کے لئے ضروری انتظامات شروع کرا دیئے گئے ہیں ۔ جواہر لال کے بیان کا مطلب صرف یہ ہے کہ کانگریس یہ میدان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں لیکن اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہے وہ غور و فکر اور مشورۂ احباب کے بعد طے کرنا ہے اور اس پر اس طرح کے سرسری اور اجمالی بیانات کا کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

میں احباب سے مشورہ کرنے کے لئے ضرور وقت نکالوں گا ۔ ۲۷ کو دہلی میں غیر لیگی مسلم جماعتوں کا ایک مرکزی بورڈ بن رہا ہے جس کا پہلا جلسہ ۲۵ کو ہوگا جب میں بمبئی سے دہلی جا سکوں گا ۔ بہر حال بمبئی میں بھی مشورہ و ملاقات کا موقع ہے ۔ ۳۰ تک میں وہاں ہوں اور اس کے بعد بھی ایک دن ٹھہر سکتا ہوں کیا آپ بمبئی آ رہے ہیں؟ بہت بہتر ہو اگر آپ آ جائیں ۔ اس سے بھی زیادہ بہتر یہ ہو کہ ۲۵ اور اس کے بعد کی تاریخوں میں دہلی آئیں جہاں یکسوئی اور آہستہ فرصت ہوگی ۔ مقصود اصل یہ ہے کہ آئیے اور ملئے خواہ بمبئی ہو یا دہلی ۔

زمن گرت نہ بود یاد در انتظار بیا
بیا بہ صحبت صباش دستینہ کار بیا

آپ سے ملے ایک زمانہ ہو گیا ۔

ابوالکلام

پہلی بات

پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں۔ ان کی وفات کے بعد ہندوستان میں چند اخبارات و رسائل نے خاص نمبر شائع کئے۔ جن میں ہند و پاکستان کے چوٹی کے ادیبوں نے حصہ لیا، اور مولانا کی شخصیت، فن اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

یہ نمبر چونکہ صرف ہندوستان تک ہی محدود رہے اور پاکستان میں مہیّا نہ ہوسکے اس لئے ہم نے ان جواہر ریزوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

اس کتاب کی اشاعت میں کاروباری نقطۂ نظر کم اور مولانا کے شیدائیوں کے لئے اُردو ادب کے معماروں کے رشحاتِ قلم یکجا کرنے کا جذبہ زیادہ پیشِ نظر رہا تاکہ قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہونے پائے۔

اس کتاب کے مضامین کے سلسلہ میں نئی دُنیا، آجکل، شاہراہ دہلی، اور صبا حیدرآباد خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

انور عارف

نئی دہلی

۲۹ راکتوبر ۴۶ء

صدیقی! خط مورخہ ۲۱ راکتوبر وصول ہوا۔ میرے لئے نہایت خوشی کا
باعث ہوگا کہ مرزا* صاحب سے ملاقات کا موقعہ پیدا ہو، لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ۸ ر نومبر کو دہلی میں
ہوں گا یا باہر دورے میں۔ علاوہ بریں جامعہ ملیہ سے معلوم ہوا تھا کہ مرزا صاحب تقریب جوبلی میں
شریک ہونگے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تقریب ۱۵ راکتوبر کو ہونیوالی ہے اور غالباً مجھے بھی دہلی دورہ ہی
کے لئے آنا پڑے۔ اس موقعہ پر ملاقات کی صورت نکل سکتی ہے۔

کمزوری صحت کی وجہ سے رات کا وقت میرے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ ایسا ہو سکتا
ہے کہ آصف علی، مرزا صاحب کو پہنچا دیا جائے ہم بلالیں اور ملاقات کی صورت نکل آئے
بہر حال کوئی نہ کوئی موقعہ ملاقات کا نکل آئے گا۔

اگر ۸ نومبر تک میرا قیام یہاں رہا تو وہ موقعہ کام میں لایا جا سکتا ہے نہیں تو جامعہ
ملیہ کی تقریب کا موقعہ بشرطیکہ مرزا صاحب اس میں شریک ہو رہے ہوں

ایک خط مہر سرن بھیج رہا ہوں۔

والسلام

ابوالکلام

---

* سر مرزا اسمٰعیل جب کہ وہ حیدرآباد کے "صدر اعظم" نہیں بنے تھے۔

ترتیب

○ دیباچہ — ڈاکٹر سیّد محمود — ۱۷
○ آزاد - ایک رفیقِ کار — جواہر لعل نہرو — ۲۵
○ چند یادیں — عبدالماجد دریا آبادی — ۳۰
○ عہد آفریں شخصیت — پروفیسر ہمایوں کبیر — ۴۱
○ مولانا ابوالکلام آزاد — خواجہ غلام السیّدین — ۴۷
○ علم و عمل کا سنگم — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۵۷
○ مولانا کی قلمی تصویر — خواجہ حسن نظامی — ۶۳
○ مولانا آزاد کی صحافتی عظمت — علامہ نیاز فتحپوری — ۶۶
○ مولانا ابوالکلام آزاد — غلام رسول مہر — ۸۳
○ مولانا آزاد غبارِ خاطر کے آئینے میں — گوپی ناتھ امن — ۹۸
○ آہ! ابوالکلام — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۱۲

لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

AL-HILAL

Abul Kalam Azad

CALCUTTA

"AL-HILAL"

[illegible]

Weekly 4-12

الہلال

ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

مدیر و مسئول خصوصی

مقام اشاعت

قیمت

سالانہ ۸ روپے

ششماہی ۴ روپیہ ۱۲ آنہ

۲ — کلکتہ چہارشنبہ ۲۶ ربیع الاول ۱۳۳۱ ہجری — ۹.

Calcutta [illegible] March 5 1913

فہرس — تلغراف خصوصی

"الہلال" کے پہلے صفحے کا عکس

رُباعی

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی

اب زندہ دل کہاں ہیں باقی ساقی

میخانے نے رنگ و روپ بدلا ایسا

میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد
بحیثیت
ایڈیٹر
الہلال
و
البلاغ

○ فخر دہلی — ملّا واحدی — ۱۲۲

○ عقیدت کے آنسو — عبدالرزّاق ملیح آبادی — ۱۲۵

○ مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب — محمد اجمل خاں — ۱۳۵

○ میر تقی میر سے غالب کی ملاقات کی وضاحت — مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب — ۱۶۴

○ تذکرہ — پروفیسر محمد مُجیب — ۱۷۱

○ زلیخا — حمیدہ سُلطان — ۱۹۱

○ نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح — غلام احمد فرقت کاکوروی — ۲۰۱

○ مولانا آزاد کی شخصیت — ریاض الرّحمان شروانی — ۲۱۴

○ مولانا آزاد سے ایک ملاقات — دیوان سنگھ مفتوں — ۲۲۳

○ ایک محسن کی یاد میں — جگن ناتھ آزاد — ۲۴۵

○ ابوالکلام آزاد کا سفرِ آخرت — شورش کاشمیری — ۲۵۵

○ اظہارِ عقیدت — مسز ارونا آصف علی — ۲۷۱

مولانا مرحوم کی ذات با صفات اور شخصیت با برکت کا تذکرہ اب ہماری
قومی اور ملی زندگی کا انمول اثاثہ ہے اور ہمیشہ رہے گا ۔ اس سے ہزار ہا پہلو
اور لاتعداد رنگ ہم حوصلہ پائیں گے ، روشنی حاصل کرینگے ۔ اور یقیناً آئندہ
کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا ، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم
ہمارے احساس و تاثیر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے
ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر
سکتے ہیں کہ ان نقوش کو سنوارتے رہیں اور بہر پہلو و بہر حال سنواریں ۔
مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اس کے احساس
کی چبھن کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدت نے شعور کو نڈھال کر
دیا ہے ورنہ ان کی ذات سے جو مجھے شغف رہا اور باون سال تک جو

ناشر ... ... انور عارف مالک مکتبہ ماحول

طابع ... ... جاوید پرنٹنگ پریس کراچی

پہلی بار ... ... مئی ۱۹۵۹ء

قیمت ... ... چار روپے

جس میں ایک سمت علم و فکر کی بالکل وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمت اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبد اللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش وہر انداز سے ٹپکتی نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے بیتے جاگتے شہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرزِ گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا۔ جو خطیبانہ مگر تیز رو تھا معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور ان کے درمیان حماسہ، متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اُن کے حافظے کا کمال یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرنگ میں احمد نگر جیل ہماری فرصتوں کا آماجگاہ بنا تو انہوں نے اُس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا موضوع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دہرائیں کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھیں اُن کو ہمیشہ اسی طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب

اُن سے نیاز خصوصی حاصل رہا۔ اس کی ایک الگ داستان تقریب
کرنے کے لئے اگر فرصت کے لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے جز پورے
کرنے کی ہمّت بھی ہو جائے تو بھی مستعدی دل و دماغ کہاں سے لاؤنگا؟
اس تمام عرصہ میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور اُن سے
جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی
واقفیت اور اپنے تجربہ کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا
ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل اجل، ذہین، طباع اور اسلامی علوم پر
گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔
انیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد
اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ، مولانا مرحوم
ان دونوں کے نچوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔
اب ان کے گذرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات میں شدت سے
احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

کم لذتم وقیمتم افزوں زشمار است
گوئی ثمر بیشتر از باغ وجودم

گنگنایا کرتے تھے وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی، اور
اپنی ہی بات کو زیرِ لب دہرانے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک
لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا۔ کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے

سے گیکی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والئی رام پور فرما رہے تھے جلسہ کا مقصد ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "الہلال" "الہلال" کہہ کر چلا اٹھا۔ انہوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی بیچارے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے بتدریج پختہ ہوتے گئے اور میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو انہیں کے یہاں قیام کرتا تھا اُن کی غیور اور خوددار فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انہوں نے کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انہیں سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دست سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو اُن کو گورنمنٹ سے نظر بندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و عسرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف نہ آنے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منت و سماجت اور اصرار کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ لفظ وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ضبط کا

جیسے ۱۹۰۸ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علیگڑھ آئے تو دیگر حضرات کے ہمراہ میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول گیا تھا۔ لیکن اُن کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فنِ خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جاچکا ہے لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ دو تین موقعے ایسے ابھرتے ہیں جہاں میں نے انہیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کہ جنگ بلقان کی گرما گرمی تھی۔ لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا۔ کہ مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اس وقت الہلال کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آگئے تو جلسہ میں لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کے تقریر کے لئے تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت کے اشارے پر یونی ورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا آزاد تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونیورسٹی منظور نہ کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر تھے کہ انہوں نے کبھی وقت و

آئندہ کی فکر کرنی ہے" کوئی تھا جو اس بلند اخلاق اور حسن کردار سے
متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مضرت رساں سیاست
کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف
یہ کہا کہ "میں اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"
اگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر
مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی
زندگی ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔
اس عظیم شخصیت کے لئے اتنے الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی
لیکن فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات
ہمیشہ صفحۂ ہستی پر ثبت رہیں گی۔

هرگز نمیرد آن که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریده عالم دوام ما..

ڈاکٹر سید محمود

یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انہیں غصہ آیا ہو ہر مسئلے پر بہت ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی برائی کرنے والوں کو بھی برا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی ان کے سامنے برائی کرتا تو وہ اس کی اچھائی بیان کرتے تعریف کر دیتے تھے۔ صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی پر بھی انہوں نے اپنے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات و لیڈران نے ان کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اس نیک دل نے اس وقت کسی پبلک اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں ان کی شکایت کی اور نہ وہ ان کے بارے میں بھی کوئی عامی لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریے کی ہلاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا انہوں نے کبھی طعنے یا شکوے کر کے بدلہ چکانے کی سوچی بلکہ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے مسلم کنونشن کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے تو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو برا بھلا کہیں گے۔

اس کے لیڈروں کی پول کھولیں گے اور انکی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔

مگر ان کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو

"آزاد" ایک رفیقِ کار

جواہر لعل نہرو

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہارِ خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب وہ ہستی ایسی سیاسی رفیق ہو کہ قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں ساتھی رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قلم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تقریباً تیس سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی۔ لیکن مولانا کی علمیت قومی کاموں میں عزم و ثبات اور جنگِ عظیم کے دوران میں ان کی نظر بندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا، اور ان سے ملنے کے لئے بیتاب تھا۔ عمر کے اعتبار سے ابھی ان کا عالم شباب تھا۔ لیکن ان کے چہرے پہ پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے۔ اور اس طرح ان کی جگہ بزرگانِ کانگریس میں ناگزیر تھی۔ چوں کہ مجھے خود بھی اس وقت کانگریس کے اندرونی حلقوں سے اتنا زیادہ گہرا ربط

ابوالکلام آزاد

باوقار مقرر ہونے کے شوروشغف اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کردیا تھا۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے تھے جو انقلاب فرانس سے کچھ پہلے موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضی میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلل، باضابطہ اور سلجھا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اگر اس وقت خلوت پسندی اور شرمیلاپن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا، تو ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز تھا، جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت عمل کی طرف راغب کر سکتا تھا۔ ہم نے یہ اعجاز اور آواز پبلک میں بہت کم سنی اور بدقسمتی سے انہوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی تھیں۔

مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے۔ کیونکہ جو زبان وہ لکھتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ پُر معنی الفاظ سے مملو ہوتی تھی۔ شباب میں ہی انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا عربی ممالک اور مصر سے

وضبط نہیں تھا۔ اس لئے اس وقت انہیں دوُر سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا لیکن اس کے بعد کانگریس میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں مجھے ان کو بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے اُن سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایّام قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے دنوں کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے اندر مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کی حصول رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کانگریس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز اور عزائم کی تراش وخراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروفِ کار رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر۔ ان کے آزاد مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ ان کی راؤں اور مشوروں کے پس پردہ دانش، تدبّر، اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں ہوتی جارہی تھی۔

مولانا دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاستدان تھے۔ آپ ایک کامیاب سیاستدان کے طبعی مزاج سے معرّیٰ تھے۔ جو ٹھوس اور بے حس ہوکر حملے کرنے اور حملے سُننے کے قابل ہوجاتا ہے۔ آپ کی افتادِ طبیعت سر تا سر اسکے خلاف تھی۔ وہ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند تھے۔ اور مزید براں ان کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل تھا۔ باوجود ایک مؤثر اور

آسکے گی۔ مولانا آزاد نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی جبکہ انہوں نے یہ کہا کہ اسلامی ممالک امپیریلزم کے پنجے سے تبھی بچائے جاسکتے ہیں۔ جب بھارت آزاد ہوگا۔ مولانا ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت کا دل پسند مجموعہ تھے۔ وہ پرانے زمانے کی عظمتیں، خصلتیں مثلاً رواداری، شفقت، تحمل مزاجی بدرجہ اتم رکھتے تھے۔

آج انسان چاند تک پہنچنے کا متمنی ہے۔ لیکن ہم میں تحمل مزاجی مروّت اور رواداری کا زبردست فقدان ہے۔ مولانا اس کلچر کے نمائندہ تھے۔ جو مختلف کلچر دل کے آپس میں سموئے جانے سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ مولانا آزاد روشن فہم و فراست کے مالک تھے اور مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی حیران کن صلاحیت رکھتے تھے۔ ایسے دوست، رفیق کار، ساتھی لیڈر اور متعلم کی وفات یقیناً گہرا خلا پیدا کر دیتی ہے۔ جو وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ مولانا ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کا پیغام زندہ ہے۔ اور یہ ماضی کی طرح ہمیں روشنی دیتا رہے گا۔

خراجِ تحسین حاصل کرلیا تھا ۔ اور وہ محض ان کے قلم کی بدولت تھا۔ اور اب تک یہ حالت تھی۔ کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان سے جاتا ہے اس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے اگر انہوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنابریں صحیح راہ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی ۔

یہ محض حالات کا تقاضہ تھا کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کاندھو پر لینے کے لئے مجبور ہو گئے ۔ اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انہوں نے یہ سب کچھ بروجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم جنہوں نے ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل کی ہے ۔ تاریخ کے فیصلہ کے لئے زحمت کش انتظار کیوں ہوں ؛ وہ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے توتوں کا ایک محکم پہاڑ تھے قطع نظر اس کے کہ کبھی ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا بالاتفاق ہمیشہ یہ بات ملحوظِ خاطر رکھتے رہے ۔ کہ ان کی رائے ہمیشہ بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے ۔ اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صاحب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو ۔ اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں ۔

بڑے آدمی پیدا ہوتے آئے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن مولانا جس خاص نوعیت کی عظمت کے مالک تھے ، وہ بھارت یا کسی اور جگہ نظر نہ

سے اُنھوں نے اپنا لیا تھا اور اس میں جدید طبقہ کے جواب میں طبی، شرعی، ہر قسم کے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ عورت، مرد کے برابر نہیں۔ اور دونوں کی مساوات کا دعویٰ تمام تر غلط ہے۔ مضمون نگار کی طرف سے دل و دماغ میں عظمت پیدا کرنے کے لئے بس اسی قدر کافی تھا۔ ایک آدھ پرچہ میں بلند پایہ مصری رسالوں سے ماخوذ "علمی خبریں" بھی اسی قلم سے نکلیں۔ زورِ قلم اور جوشِ تحریر سے ایسا اندازہ ہوا کہ شخصیت بھی بڑی ہی زوردار ہو گی۔ اور صورت کا نقشہ ذہن کے سامنے یہ جما کہ بڑے سن کے ٹھسّے کے ہوں گے۔ آواز سب پر غالب رہتی ہو گی۔ کسی کو اپنے سامنے بولنے نہ دیتے ہوں گے۔

●

دو ڈھائی سال اور گذر رہے۔ میں لکھنؤ میں کالج کا طالب علم تھا۔ کہ سردی کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت دو چار ساتھیوں سمیت کسی ضرورت سے اسٹیشن جانا ہوا۔ پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگریٹ پیتے برآمد ہوئے۔ گورے، چِٹّے، خوش رو، عامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، جوانِ رعنا ایسے کہ نظران پر خواہ مخواہ پڑے، پوچھ گچھ شروع ہوئی، کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ زمانہ کوئی اخیر ۱۹۰۹ء کا ہو گا۔ مولانا عرصہ ہوا الندوہ سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ چھوڑ چکے تھے۔ کچھ دنوں تک امرتسر کے معروف و معزز سہ روزہ وکیل

ابوالکلام آزاد

چند یادیں

عبدالماجد دریا آبادی

۱۹۰۵ئ کا آخری زمانہ تھا۔ جب یہ نام اول اول نظر سے گذرا، الندوہ مرحوم کے ایک محترم مضمون نگار کی حیثیت سے میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ غالباً نویں درجہ کا اور مرحوم اُس وقت بھی تحریر میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکے تھے۔ سِن میں مجھ سے کُل ۳، ۴ سال بڑے تھے، الندوہ مولانا شبلی نعمانی کی ادارت میں وقت کا ممتاز ترین ماہنامہ علمی اعتبار سے تھا۔ اس کی مضمون نگاری بجائے خود ایک اعلیٰ سند تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید شہادت کی ضرورت ہی نہ تھی — مولانا اس وقت تک "مولانا" نہ تھے، محض ابوالکلام آزاد تھے۔ ماہنامہ خدنگ نظر (لکھنو) میں ایک آدھ مضمون لکھ چکے تھے۔ اور شاید اپنا ہفتہ وار "لسان الصدق" (کلکتہ) بھی کچھ دن تک نکال چکے تھے۔ بہرحال الندوہ میں موضوعِ تحریر فرید وجدی مصری کی کتاب المراۃ لمسلمہ تھی جسے مولانا نے عربی

صراح وقاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی اور "ایڈیٹر" کہاں! اس کی جگہ "مدیر مسئول" محررِ خصوصی اور رئیس قلم تحریر" جریدہ کی جگہ" مجلہ" ولایتی ڈاک کی جگہ" برید فرنگ "حیرت انگیز کی جگہ" محیر العقول" قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے، اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتہ اس ادبی وعلمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر آنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے! — حالی وشبلی کی سلاست وسادگی سر پیٹتی رہی۔ اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو! سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے!

●

الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلّم طور پر مولانا ہو گئے اور شہرت کے پروں سے اڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی اور مولانا کی خدمت کے جوہر بھی اسی وقت سے خوب چمکے۔ ہر جلسہ کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا، لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی۔ اور اس کی سیاست پر بین الملی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ بات بات پر آیات قرآنی سے استدلال واستناد۔ علمی ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور فکاہی رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا۔ اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی۔ اور بڑے بڑے اس کے ٹکر لیتے دیتے ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی۔ بذلہ سنجی کا نمایاں

ہیں رہے تھے۔ اور اور بھی رسالوں میں ان کا نام آنے لگا تھا۔ اصل صورت خیالی صورت سے بالکل مختلف نکلی اور کہیں زیادہ حسین و جاذب نظر۔

●

ملاقات اور ذاتی حصول نیاز کی نوبت اس کے بھی بعد آئی۔ سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا اور آزاد اس وقت مولانا شبلی کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا اس وقت محلہ احاطہ فقیر محمد خاں کی ایک گلی کے اندر ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کا نام مہمان کی زبان پر صرف "آزاد تھا"۔ نہ مولوی، نہ مولانا، نہ محی الدین، نہ ابوالکلام، بلکہ صرف "آزاد"، زبان پر بھی یہی اور خطوط میں قلم پر بھی یہی۔ غیر معمولی ذہانت، خطابت طرازی، طلاقتِ لسانی کے قصے اسی زمانے سے سننے میں آنے لگے۔ لیکن مولانا شبلی کے سامنے میں نے انہیں ہمیشہ با ادب ہی پایا۔ تنہائی کی صحبتوں میں ممکن ہے کہ بے تکلفی زیادہ برتتے ہوں، لیکن بہرحال اپنی شہادت تو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی چیزوں تک محدود رہے گی۔

اسی کے بعد غالباً ۱۹۱۲ء میں الہلال اُفق کلکتہ سے طلوع ہوا۔ اور اب مولانا کا قیام کلکتہ میں مستقل ہو چکا تھا۔ اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی۔ صورت و سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ داروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار، چھپائی، کاغذ تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ ــــ رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا۔ "احمد المکنی، بابی الکلام الدہلوی" یہ "المکنی" کے صحیح تلفظ اور معنی کے لئے

یہ سب کچھ تو اخبار کی صفحات پر ہوا رہا، لیکن مولانا کا ظرف اور جوہر شرافت جو آگے چل کر بہت نمایاں ہوا، اس وقت بھی بہر حال اتنا موجود تھا کہ اس نے کوئی اثر بھی کے تعلقات پر نہ پڑنے دیا۔ آپس کی خط و کتابت اسی طرح جاری رہی، جیسے پہلے تھی اور مولانا جواب پابندی کے ساتھ اور دوستی شفقت و محبت کے لہجہ میں بدستور دیتے رہے۔ لکھنو اب جب کبھی آتے تو نان و نمک کے لئے ایک آدھ بار غریب خانہ کو بھی سرفراز کیا۔ اور جب اس کا موقع نہ نکل سکا، تو میں نے خود ہی ماحضر مولانا کے ہوٹل پہنچا دیا۔ میں اس وقت تک دریا آبادی نہیں، لکھنوی ہی تھا ——— اسی زمانہ میں کہ یہ ذکر جون ۱۹۱۳ء کا ہے ایم، اے کا امتحان دے چکنے کے بعد میرا جانا کلکتہ کا ہوا تو مولانا نے اصرار کر کے اپنے ہاں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرایا اور خوب خاطر یں کر کے مہمان نوازی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ ضمناً و تبعاً سہی لیکن بہر حال یہ بات بھی اس منزل پر سُن لینے کے قابل ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب الہلال کے اسٹاف میں بہترین اشخاص کا مجمع تھا۔ تین نام یاد رہ گئے، حامد علی صدیقی، مولانا عبداللہ عمادی اور سب سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی ——— روزنامہ کے لئے نہیں، ایک ہفتہ وار کے لئے اتنا بڑا اور ایسا گھرا اسٹاف اردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کیوں نصیب ہوا ہوگا!

●

جن لوگوں نے مولانا کو یہ ایسی سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری،

ترین دور یہی رہا ہے۔ لکھنو آتے جاتے رہتے۔ قیام شروع میں مولانا شبلی کے رہنا دجواب خود نئے بنے ہوئے امین آباد پارک کے ایک بالاخانے پر اٹھ آئے تھے اور الفاروق وسیرۃ النعمان سے کہیں زیادہ اب شعرالعجم کے مصنف نظر آنے لگے تھے اور مولوی سے بڑھکر غزل گو، شاعر اور نقاد کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے) پھر جب مولانا لکھنؤ سے منتقل ہوکر اپنے وطن اعظم گڈھ چلے گئے تو بھوپال ہاؤس (جس کا اب وجود بھی باقی نہیں، لال باغ میں نواب صفی الدولہ حسام الملک علی حسن خاں بھوپال کے ہاں بھی ایک آدھ بار ٹھہرے اور اس کے بعد اپنے لئے مستقل مہمان خانہ حسین گنج کے سول اینڈ ملٹری ہوٹل (موجودہ برلنگٹن ہوٹل) کو بنالیا تھا — الہلال کی دعوت سے اس وقت کے اس ملحد نیازمند کو اتفاق کیونکر ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ جب کوئی علمی رعب بھی دماغ پر مولانا شبلی کی طرح ان کا نہ تھا اور دل میں ان کی وقعت بجائے کسی عالم وفاضل کے محض ایک لسّان اور پُرجوش خطیب کی تھی، ادھر مولانا شبلی نے یہ کیا کہ میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) جو الندوہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ الہلال کی طرف منتقل کردیا۔ اس کی تاب نہ لا سکا۔ اور بحث جو اس نوعمری کے جوش میں بحث وجدل کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ کچھ ہی روز بعد بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحب الہلال سے الجھ ہی پڑی۔ دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا جنہوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوا دیا ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہنچی۔

خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے، اور ہر وقت مستحضر، مذہب ہو کہ الہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات، جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی — یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں ماہر فن تقریر کر رہا ہے۔ اور تقریر بھی ایسی دلآویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے، غضب کا حافظہ تھا اور غضب کی خوش دماغی — اور زبانوں پہ عبور تو اور ہی حیرت انگیز تھا۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ جلسہ ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے فارسی شعر میں ان کا تبحر دیکھ کر گمان یہ گذرتا تھا کہ اساتذہ فارسی کے دیوان کے دیوان اس شخص نے نوک زبان کر لئے ہیں! — اور اردو کے لئے تو کچھ کہنا ہی تحصیل حاصل ہے۔ زبان مادری سہی، پھر بھی اس سے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی وسیع اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے اس جامعیت کے معیار پر فیل ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کسی حد تک بھی اگر کسی کی ذات رکھی جا سکتی ہے تو وہ ابوالکلام کی۔ اور یہ اردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ انہوں نے اپنی "تاریخوں" کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے۔ "تاریخ اردو" میں ان کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت صاحب طرز انشاء پرداز کے ان کے نام کا باب عالی شان بھی ہونا چاہیئے ان کو انہوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے

۲۵، ۳۰ سال میں دیکھا ہے وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ ۱۳ء ۱۴ء میں کیا تھے (اور اس سے بھی قبل یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں بلکہ آغاز جوانی کے سن میں وہ کیا تھے اسے تو سرے سے چھوڑیئے) ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں اُستاد، اسے چھیڑا، اسے بنایا، اس پر فقرہ چست کیا، اسے چٹکیوں میں اُڑایا، لوگ تنہا ملتے جھجکتے، سامنا کرتے گھبراتے، ہچکچاتے اور کنی کاٹ جاتے۔ ۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۴ء کا شروع لکھنو میں کمد نے پھر بلانے کو بلالیا لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ ـــــ اپنے جوار میں ایک بڑے طرار، شوخ گفتار، طلق اللسان، خوش بیان، ادیب و ظریف چودھری محمد علی ردولوی تھے (بقید حیات نہیں، ماشاءاللہ اس وقت بھی ہیں) بس انہیں گھیر گھار کر لے آیا گیا، اور ہم تماشائیوں کو لطف مہذب و شستہ لطیفہ گوئی بذلہ سنجی اور برابر نوک جھونک کا آتا رہا ـــــ چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقۂ ظرافت کی اصطلاح میں بور BORE بیالوجی، مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے بور مرحمت کم عقل کرے ارادہ دیگراں را مکلف باشد ـ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ تعریف کے لئے زبان بھی آپ نے خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی!

•

باضابطہ تعلیم اور اصلاحی تدریس تو مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی و حال کی طرح تو کچھ ایسی زیادہ نہ تھی، لیکن خدا معلوم کتنے علوم اور متعدد فنون کے

آ دا خر ۱۹۲۸ء میں "نہرو رپورٹ" کی اشاعت کے بعد سے پھر تعلقات گھٹ گئے اور ہم دونوں کی سیاسی راہیں الگ ہوتی چلی گئیں، پھر بھی مولانا نے تمام تر اس نیاز مند کو فراموش نہ کیا اور آخری بار جیل سے نکلنے کے بعد جب غبارِ خاطر شائع کی تو اس کا ایک نسخہ لطف فرمایا۔ یہ بات شاید ۱۹۴۵ء کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب مولانا سرکار ہند میں وزارتِ تعلیم کے منصب پر فائز ہوئے تو بجائے خالص مبارکباد پیش کرنے کے اس گستاخ نے ڈھٹائی کے ساتھ کچھ اس قسم کا خط لکھ مارا کہ "اس سرکاری تقرر سے تو ہم نیاز مندانِ قدیم کو کچھ زیادہ خوشی نہیں۔ جی یہ چاہتا تھا کہ اس سرکاری تعلق سے جہاں ہر وقت سلیقہ کاغذات پر دستخط کرنے اور فائیلوں کی ورق گردانی سے رہے گا۔ آپ آزاد رہ کر سرکار ہند کے ایک غیر سرکاری مشیرِ اعلیٰ وزارت علوم و معارف رہتے۔"

●

۱۹۴۸ء تھا کہ آل انڈیا ریڈیو مشورتی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے دہلی جانا ہوا۔ مولانا اسی تپاک اور گرمجوشی سے ملے کہ جیسے پہلے کسی زمانہ میں ملتے تھے۔ وزارت ہند کی اونچی کرسی کوئی فرق اس میں پیدا نہ کرسکی۔ دوپہر کے لنچ پر بلایا اور اسی روز پشاور کے خان عبدالغنی د فرزند خان عبدالغفار بھی موجود تھے۔ ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں وہی شور وہی طلاقت لسانی وہی جامعیت و ہمہ گیری سننے والا حیران و ششدر۔ خوش خلقی انسانی ہمدردی، مرنجان و مرنج میں پہلے سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ترقی و ترقی

یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس ہی میں نہ پائے۔

●

۱۹۲۲ء تھا۔ اور مولانا رانچی جیل میں نظر بند تھے۔ خیال آیا اور احساس پیدا ہوا کہ الہلال کے زمانہ سے جو شکر رنجی سی مولانا سے چلی آرہی ہے وہ اسے بالکل دور ہونا چاہیئے۔ معذرت کا خط ڈرتے ڈرتے لکھا کہ دیکھئے جواب کیا آتا ہے۔ جواب جو آیا محض ضابطہ کا نہیں شرافت اور اعلیٰ ظرفی کے کمال کا مظہر تھا۔ الہلال کی بندش خود مولانا کی اسیری اور نظر بندی اور البلاغ کی چند روزہ اشاعت کے بعد سے مولانا کا رنگ دوسرا۔ اب اُن کا شمار ملک کے صفِ اول کے لیڈروں میں تھا اور دعوت کا رُخ بھی ہندوستانی قومیت کی طرف پھر گیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ وہ کانگریس کے بڑوں میں تھے اور ان کی مانگ ہر بڑے سیاسی جلسے میں ہونے لگی۔ لیڈروں میں اب وہ اتنا گھر گئے تھے کہ ہم قدیم، بے تکلف نیازمندوں کی رسائی بھی ان تک مشکل تھی۔ پھر بھی کسی درجہ میں وہ اپنی وضعداری کو نبھائے گئے۔ ۱۹۲۵ء تھا کہ خلافت کمیٹی کے رشتہ سے تعلقات کی تجدید از سرِ نو ہوئی اور ملاقاتیں جلد جلد ہونے لگیں۔ اب مولانا صدرِ خلافت تھے اور یہ نیازمند بھی ایک چھوٹا موٹا سا صدر اپنے صوبہ کی خلافت کمیٹی کا۔ سالانہ جلسوں کے علاوہ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر مجلس عاملہ خلافت کے جلسے بار بار ہوتے اور کانپور لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بارہا نیاز کے مواقع ملے۔

...رین

...یثیت

پروفیسر ہمایوں کبیر

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان میں علم و ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے لیکن آج تک ان کے ہم وطن جن میں اُن کے مداح اور ناقد دونوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا یہ بحیثیت سیاست دان۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل ہی میں تھے کہ انہوں نے "الہلال" اور "البلاغ" میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ و ارفع ذہنیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ "الہلال" کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے انہوں نے اُردو نثر میں ایک نئے اسلوبِ نگارش کی بنیاد ڈالی۔

کے بجائے پیکر تواضع بنے ہوئے۔ شرافت نفس اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنے مخالفین خصوصاً مسلم لیگ کے لئے گلہ شکوہ کا شائبہ بھی زبان پر نہیں، سب کا ذکر یکساں خوش دلی سے، بلکہ پاکستان کے حق میں بجائے شکایت و شماتت طنز و تعریض کے الٹا کلمہ خیر! اور کچھ اس قسم کے الفاظ، کہ اب جبکہ وہ بن چکا ہے تو ہم سب کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ طاقتور بنے۔ اسیاسی لیڈروں میں اس ظرف کی مثال نادر ہی ملے گی۔

شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا۔
اور بعض سربرآوردہ مسلم سیاستدانوں کے حلقے بعض ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں
کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ مؤقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ "الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت
کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد
مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی
روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چونکہ مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی
حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لئے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے دل کو
کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انہیں لوگوں کے
لئے متعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انہیں عقائد پر نظر رکھتے
ہیں جو اکثر ملا پیروں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دیئے ہیں۔ اسلام نے جس نے جمہوریت
آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جو اس سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی،
جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ چنانچہ
وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے
کے لئے کمر بستہ ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ
سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہو سکیں۔ ایک عالم

مگر اُس وقت کے نوجوانوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرسید احمد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر کوشش کی کہ فاتحوں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت بن کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بُری پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک و قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے مدِ مقابل تھی جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سرسید کی ہندوؤں سے دوستی اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی

گھبرائے۔ اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہو گئے تھے مولانا
کی ہمت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشاں بھی تھی اور کم آمیز بھی۔ اس
لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے۔ مثلاً یہ
کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی
تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محض ایک سیاح کی حیثیت
سے جامعۂ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم
کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور
عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر
کی کہ بالمشافہ گفتگو کر کے بعض مسائل طے کر لئے جائیں چنانچہ جب نوجوان مولانا اس
بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ
کے باپ کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا؟ ایک اور کہانی بڑی مشہور
ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا
وہاں پہنچے تو انہیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آسکتا تھا کہ یہ
بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے کسی کو جسمانی طاقت
عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو
شہرت و عظمت عطا کرتی ہے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے انعامات ایک ہی

کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست داں عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہوئے تھے لیکن انہوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسند یا ناپسند ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انہوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی توازن اور سنجیدگی کی وجہ سے اُن کا مشاہدہ بہت صاف تھا۔ جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی سے پرکھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جبکہ توازن پر تعصب غالب آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم زیرِ نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے انکے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی غیر ذاتی حیثیت حاصل ہوئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں تلخ ترین مباحثوں میں بھی ان کے منہ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انہوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انہوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ جنہوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں

مولانا ابوالکلام آزاد

خواجہ غلام السیدین

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں۔ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی سخت نگیہ کسوٹی پر ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو پہاڑ کے دامن میں اپنی زندگی گذارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی پابندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی شورشوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جو جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؛ اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی عصر

شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنہیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا۔ جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ اُن تمام انعامات کے ساتھ انہیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسان کے دکھ درد کیلئے ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف اس قدر غلطیوں فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بے چین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا۔ جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ پھر بھی ان کی ضیا الگ تھلگ تھی۔ جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طبع خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دُکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دُکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انہیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ بنیادی طور پر وہ عقلیت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

تھے لیکن ملّا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا ؎

نہ فلسفی سے نہ ملّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

ان کے نزدیک مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست داں تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند، جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام نہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اترے، بلکہ محبت اور سمجھداری کے ساتھ انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب کبھی وہ راستے سے بھٹکے اور مولانا کی طرف سے انہوں نے بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور معلمی اور ہدایت کے فرض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑایا لیکن یہ مردِ مجاہد، یہ کوہ وقار مومن اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ اس شان کے ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، نہ

آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول اور رنگ ڈھنگ کے خاص سانچے ڈھالتی ہے ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کا اٹوٹ سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی دیکھئے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انہوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، انسان دوستی عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کار فرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین

تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی پر سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ فلاں "چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی ترازو میں عدل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی!

انہوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند کی مصیبتوں اور قربانی اور ایثار کی آزمائشوں کو سہتا کا گھونٹ بنا کر پیا۔ لیکن جب آزادی حاصل ہوئی تو انہوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقف کر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشش انصاف اور دیانت داری پر غالب آجائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو "قوم کے ضمیر" کا خطاب دیا تھا یعنی اس میدان میں انہوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا تھا جو گاندھی جی انجام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگرس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انہوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہ

مخالفوں اور بدباطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی درجہ، ذہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ "یہ کیسے عاقبت ناشناس ہیں! "یعنی نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ ان کے دل میں کینہ کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ انہوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو ان کے قلبِ صافی کا نقشہ کھینچتا ہے:

شہا است سینہ ظہوری پر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

ان کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور برائی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق اور صداقت کی رسی ہے۔ جو سیدہ کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انہوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو، اس مضبوط رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں اپنوں کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں "غیروں" سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے اپنے وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور "غیر" وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انہیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور ان کا ناخن تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے کاموں میں تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں الجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں ہر قسم کے

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اسی وجہ سے ان کے ہاں قصر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اٹھتا تھا،

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال نہ دولت، نہ جائداد و سرمایہ۔ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بے نیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی انجمن، کسی درسگاہ کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دفعہ کے سوا کسی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں!

مولانا آزاد نے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور اندازِ فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور سماج کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور لگاؤ تھا جس کے افسانے زبانِ خلق مدتوں تک سنائے گی۔ لیکن اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انہوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس زبردست تصنیف کو انہوں نے نہ کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر

عمل معین کرلی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے بے شک اب
وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم
کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اس زمانے میں ان کی
شان یہ تھی ؎

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو
یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلّی
والوں کی، بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، صبر اور ضبط کے بندھن
توڑ کر امنڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش اور
بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جم غفیر میں جو ۲۲۔ فروری کو ان کے
مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سنا " ارے تمہیں کیا معلوم ہے آزاد
نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت " ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ
کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور ڈھالنے میں اُن کا جو حصّہ تھا
اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیش نظر اس
بوڑھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو
کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا۔ ایک فقیر بھی تھا۔ فقر اقبال کی اصطلاح میں، یعنی

میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلبِ صادق کا علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مردِ مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہتِ ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی تابانی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا، مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکرِ حاضر سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے ـــ یہ تھے مولانا آزاد ـــ ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا! بقول حالی

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں	ایک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیریں بیانی	ڈھونڈتے کیا ہو سیب رمّاں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش	گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی	شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے، میں رانچی میں نظر بند تھا عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب میں بہت دور سے آیا ہوں۔"

"کہاں سے"

"سرحد پار سے۔"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انہوں نے نوکر رکھ لیا۔ اور آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی

ابوالکلام آزاد

علم و عمل کا سنگم

ڈاکٹر ذاکر حسین

میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں بیں ان کے ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی کو بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کی مٹی کے دیئے کو سلگانا چاہتا ہے اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتیاں بنائی تھیں۔ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیئے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انھیں سناتا تھا۔ اس وقت اکثر بتیاں آگ لی تھی ہوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں کہ پہلی آگ انہیں سے لی تھی۔ میں ان سے دور دور رہتا تھا اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا۔ کبھی کبھی ان سے ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ ابھی سال کا عرصہ ہوا ۱۹۵۷ء-۵۸ء کو ایک بات پر مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان سے پوچھا اس وقت آپ سے

آخر میں ایک قطعہ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیغام ہے جو دکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دشمن کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد!
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فغاں بن کر
دل پر آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد!

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھا اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روحِ فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!

یہ تو تھی جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے ۔

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناشاد چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خدا وند نداشت!

جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے ۔ انہوں نے اپنی مثال سے یہ بتایا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کیطرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دیئے جائیں۔ بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم ۔ اس مفکر، اس مرد مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں۔ اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ ذرا ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دکھایا ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا۔ لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی ایک لفظ کہا کسی کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انہوں نے شکایت کی ہو یا برا مانا ہو سب کچھ گذر جاتا تھا، اور اس کی وہ بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے۔ لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں اس لئے جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کہی جا رہی ہے۔ وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں۔ اور ایک مرد مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان

سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کمپ ـث کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کو وہ وقار نے بجائے اس کے کہ میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بھر مار کر دی جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا۔ اور وہ محبت سے اُبلتے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش تھی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے۔ مذہب کے بہت بڑے عالم تھے۔ ادب کے ۔ ادب پر لٹریچر پر بڑی نظر رکھتے تھے۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ کتابوں پر عاشق تھے اور کوئی سیاست دان یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہو وہ آخر لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے۔ کہ علم ایک بار بھی بن سکتا ہے۔ علم ایک ایسا بوجھ بن سکتا ہے۔ جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے۔ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن ان کے دل میں لگی رہی۔ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا۔

ابھی آخری مرتبہ دسمبر ۵۷ء میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا۔ اور دو کتابیں دیکھوں گا۔ افسوس کہ اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ کانگریس میں گئے۔ لیکن ان کی یہ لگن، آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو

لئے کہ پرواہ کرکے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے۔ برحق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں۔ عمل کی طرف رکھیں۔ علم کی طرف رکھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے۔ جو تفریق پیدا کرتی ہے۔ جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے وہ مذہب جھوٹا ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کیلئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ملنے کی روح ہے ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام ان لوگوں کو سیکھنا چاہئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری وحدت کو مٹانا چاہتے اس ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں تنگ وفاداریاں ہیں۔ زیادہ قومی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ اپنی چھوٹی

سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ راشٹر پتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں۔ وہ زبان جس سے پھول برستے تھے۔ اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو روشن بھی کرتی تھی وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں۔ اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔ کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بنانے کا کام کھیل نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے۔ اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام کھپ جائیں گے۔ کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہئے۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا چاہئے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں۔ کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے تھے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کسی کی جگہ پر نہیں کی جا سکتی بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے۔ جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا۔ کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایک ساتھ آ جاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آ گئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے ان

مولانا کی قلمی تصویر

خواجہ حسن نظامی مرحوم

سروقد - دوہرا بدن - گورا رنگ - ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں - کتابی چہرہ، سفید چھوٹی ڈاڑھی - آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی اور ظرافت دہلی کے رہنے والے ہیں - ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں، مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں - قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی حافظہ کی قوت بے مثال تصور کی حالت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ نازک مزاجی میں تانا شاہ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔

بیرونی ہند کے مسلمانوں میں اور امریکیوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور یورپین مؤرخ سوچتے ہیں کہ ان کو یورپین کیونکر ثابت کیا جائے - اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں - تاہم ظاہرداری اور نمودداری سے بیزار ہیں - مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے بلکہ مسٹر اسٹیفرڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی

وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑدی جائیں ۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے ۔ مسلمان نہ رہے ۔ ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہئے ۔ تب وہ سچا مسلمان ہے ۔ تب وہ سچا ہندو ہے ۔ تب وہ سچا عیسائی ہے ۔ تب وہ سچا پارسی ہے ۔ تب وہ سچا سکھ ہے ۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے ۔ اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے ۔ اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا ہر دن ہمارے لئے یہ عہد کرنے کا دن ہے ۔ کہ ہم اس روح کو مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں گے ۔

اور سیاسی چاند ہیں ان کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا اگر دوسرے سیاسی چراغ بھی روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی بہ ظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے۔ کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل نوجوان ہیں۔

بھی سیاسی درویش ہیں۔ جواہر لال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں۔ کیونکہ جو دل میں ہوتا وہی زبان سے کہتے ہیں۔ حالانکہ نئے زمانے کی سیاست میں یہ گناہ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں۔ اور کہتے جاتے ہیں۔ غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لئے بہت مفید ہے۔

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انہوں نے محسن نظامی کے ایک کاغذ پر لکھا تھا۔ سب باتیں منظور ہیں بہ استثنائے شرکت مسلم لیگ " گویا ۴۲ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے۔ جتنے آجکل ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک رازدار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعہ کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کیطرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے سوائے ان کے جو ان کی بادشاہی کو اپنے لئے نقصان رساں سمجھیں۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندوستان کے لئے سیاسی سورج ہیں۔

کیا کیا جاننا چاہئے" انہوں نے جواب دیا سب کچھ اور کچھ نہیں یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے۔ لیکن ماہر کسی کا نہ ہو" لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے۔ اور جو کچھ جانتے تھے۔ ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے۔ ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دلکش امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا۔ کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علیحدہ علیحدہ رکھ دیئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اور امتیاز رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی۔ کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالانکہ وہ بہت زیادہ وزنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

علامہ نیاز فتحپوری

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فضل وکمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیات پر اظہار خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا نے صحافتی بدایع کا ذکر کرنا اور ان تمام عطایائے فطرت کو نظر انداز کر دینا۔ جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہد حاضر کی اصلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی

مولانا اپنی فطری افتاد اپنے فکر و تصور اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے اور بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کرکے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لائیڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو

آزاد کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جس کو زمانہ نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انھیں صرف "الہلال" اور البلاغ کے رئیس التحریر یا تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے امیال و عواطف سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت لذیذ دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گذر جایا جائے ـــــ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے قواء کا منہ بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت، قدرت کا ایک سربستہ راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آ گئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے۔ جنہوں نے ان کو اپنے ذوق کو پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے۔ اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں

کے سبب سے امکانات دنیا پہ ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کے تعین وصراحت آسان نہیں۔ تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط ومطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچہ میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی۔ جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کیطرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجہ کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر وادب کیطرف متوجہ ہوتے تو عرفی ونظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف واصلاح اخلاق کیطرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلکِ اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے۔ تو اس کے تبحر علمی کا بھی ایک لطیفہ سن لیجئے یہ پیدائشی توتلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں۔ رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور نیزہ تانا" تو کیا کہو گے عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے: "رکب علی فرسہ وجر رمحہ" اس میں چار جگہ رے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استوی علی جوادہ وسحب عاملہ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آگیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا

بہت متفکر تھے۔ آخر ہز فلیس کوئی اور نہ آیا۔ پردے کار، مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سینکڑوں مدعیانِ فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں جنہوں نے مولانا کو ندوہ و اہلِ ندوہ سے بیزار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیونکہ الندوہ ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی سازشوں سے وہ تنگ آچکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھالیا۔ تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انہوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا۔ جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا۔ جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مذہب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدانِ صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقِ صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

بھی وہ اپنی شان گرانمایگی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دور صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی وصحافتی زندگی کے سلسلے میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے کے اجراء سے ہوتی ہے۔ جسے انھوں نے خود جاری کیا۔ خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہکر اسے جاری کیا گیا تھا۔ وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی۔ اور بہت سی ایسی باتیں جنہیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے۔ نہ کہہ سکتے تھے یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے۔ کسی معلمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے۔ لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی۔ ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا ایڈیٹر "المنار" کے ایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا۔ تقریر کرنے جا رہے ہیں۔ اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں

ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان و طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسید کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی۔ لیکن یہ انحراف واحتلات داخلی نہ تھا۔ خارجی تھا فاعلی نہ تھا۔ انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اسے یہ کہیے کہ اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریک آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان چند نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرون ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابل ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار دوسرا مسلم گزٹ۔ زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی۔ اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرون ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے۔ اور قدرتاً انھیں سرسید تحریک سے دلچسپی ہونا چاہئے تھی۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا۔ اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک و معاون ضرور تھا۔ لیکن انہیں علی گڑھ مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوشنود ہیں

مولانا کا رجحان سیاست کیطرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی۔ جب مصر کے جامعہ ازہر میں انہیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلہ جوالہ بن کر الہلال کی صورت ہمارے سامنے آ گئی۔

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے۔ اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی۔ اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ استقرائیت و استعماریت اپنے بقا و تحفظ کے لئے ناخن دیدگاں کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا برطانوی مستعمرات کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستین چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلّے پھوٹ چکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بار آور نہ ہونے دے گا۔ اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی۔ ان کے سامنے

ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب ولہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا۔ عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اسی لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی۔ جسے خود انہوں نے ایجاد کیا اور جو انہیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا۔ اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہئے۔ اور فرنگی تسلط کو ختم۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے۔ کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں "شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک و ملت میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام دہشت سا جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملت کے اختلافات کو نہ مٹایا جائے۔ حصول مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آئندہ سیاست کا جو نقشہ ان سامنے تھا۔ اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے مکمل تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سر نو تعمیر کی جائے وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کچھ مخلوط سی تعمیر کے قائل نہ تھے۔ بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پہ عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی

تھا۔ لیکن اس کی برہمی نہ جارحانہ تھی۔ نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے صرف منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہوگیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی ابنائے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدر اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی۔ کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گزر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس نے شخصی انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ عہد اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی۔ جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علیحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں۔ تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی۔ کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا اسلوب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے

پر واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کان پور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کردی۔ پھر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین سے بھی واقف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چنانچہ الہلال کا اولین دور اسی سعی و کوشش کا دور تھا۔ کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انہیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا اپنے ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہونچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چنانچہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست کی تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے زیادہ قابل قبول ہو سکتی

رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر
صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحہ
سادہ بنا کر اس پہ دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

یہی وہ اصولِ کار تھا جس کے پیشِ نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے
ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان
اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیاز ملت و
مذہب، بلا امتیاز نسل و رنگ کسی ایک غرض مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ
اشتراک ذہن و عمل ممکن نہ تھا۔ جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل
کی تعمیر کا خیال ترک نہ کر دیں اور اس راہ میں سب سے زیادہ مضر وہی ذہنیت تھی جس
نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک
اپنے جذباتِ نیازمندی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اول کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا نے
کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں
کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں یہ زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت
ذہنی خلجان کا دور تھا اور مولانا کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے
جس سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ آپ
دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے
مسائل پر بھی مجاہدانہ گفتگو کی ہے۔ ترکی کی اندرونی کشاکش اور اس کے خونچکاں انقلابات

ہوئی اس سے زیادہ دل چسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیرِ انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آجاتے ہیں۔ عُرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے۔ اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ قسمیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے۔ جسے عہدِ حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایۂ وعمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بزور یا زوپر نفع کاسیانِ ضعیف
بہ چینِ ابروبے درجہہِ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دورِ ملوکیت واستبداد میں یہ خیال عُرفی کے ذہن میں آئے یہ سُنکر مولانا کے چہرے پر ایک رنگ آگیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آگئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عُرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے۔ اور اس کے تمام قسمیہ اشعار اس طرح سنانا شروع کئے گویا کتاب ان کے سامنے کھُلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی وعلمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراجِ کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوبِ تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے۔ کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں

تھی ادب وانشا کی تھی ۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اعلیٰ ایک بڑا مختصر انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پبلش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوت حافظہ تھی ۔

غالباً ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں ۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی صاحبزادہ جمیل میاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے ۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں ۔ میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا ۔ لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا ۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتحپور سے دہلی پہونچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی ۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا ۔ جس پر مولانا سے تبادلہ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوت حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں ۔

ایک بار حکماء اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حی بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے ۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم

برو پیالہ خونیں بخراز قصا بال
مشو گدائے شیاتان کہ شیر می درشند

اور البلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا "خونے بہ جگر جمع کن و برون آ"۔ کا الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا ایک بے باکانہ اعلان کہ بیسے

نازک دلانِ باغ نوچوں شبنم سحر
یرودئے برگِ گل شکنند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دل گم گشتہ سراغے ست زکیفیتِ شوق
نشئہ بالا اگر از دست رود شیشۂ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور "اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتوِ ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک البیا رنگین دستۂ گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدر اوّل کا میگزین بھی جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین مذہبی و ادبی مباحث، مطائبات، منظومات الغرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوق، انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کرکے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماوراء دیر و حرم "برجا کنیم بداں آستاں رسد" کا مبلّغ ہے۔

قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔
مولانا کے اسلوب تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُرجوش خطبہ دے رہا ہے۔ اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا۔ جو الہلال کا، لیکن طریق البلاغ کچھ مختلف تھا۔ نیو وہی تھے لیکن رُخ دوسرا تھا۔ اندازِ قدوہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا:۔

"شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ"

اور البلاغ کا:۔

"جلوہ بر خود کن و خود را بر نگاہے در یاب"

الہلال۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوت دار و رسن، البلاغ بشارت روحانی تھی۔ اور پیام طاغوت شکن۔

الہلال۔ عُرفی کی زبان میں نوید سر فروشی تھا کہ

مولانا ابوالکلام آزاد

غلام رسول مہر

معاشراں گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است، بدایں قصہ اش دراز کنید

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی ہیں جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلۂ دور و سیر جاری ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا، تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا، چناں کہ توئی، ہر کسے کجا داند
بہ قدرِ طاقتِ خود مے کنند استدارک

انسانوں کے درجے

ابوالکلام آزاد

اس طرح ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو مخزن۔ اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دورِ الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اوّل خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے جس میں منطقی چون و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قائدانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سپہ عسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان کاہنوں کا سا وزن و وقار جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں ؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ہے۔ علم و فضل حقایق دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب۔ تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت اخبار نویسی و صحیفہ نگاری۔ سیاست و ملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی؟ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابل توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کمیاب ذخیرہ ہو، جو ان کی نظر سے نہ گزر چکا تھا اور اس ذخیرے کی جو مستحق اعتنا شے ان کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ مطالب ذہن میں بٹھا لیے جو انھیں پسند آئے مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجۂ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سُنے گئے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ کمال انھوں نے کیونکر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہر حال ان کی مادری زبان تھی اور حیات مستعار کے ابتدائی دس سال انھوں نے مکہ معظمہ میں گزارے تھے۔ لہٰذا اسے اہل زبان کی طرح بولنے پر تعجب نہ ہونا چاہیے عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وارد ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے۔ مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے میں نے ایک مرتبہ مولانا کو ایک ترک مہمان سے فارسی میں باتیں کرتے سنا تو حیران رہ گیا۔

عظیم الشان انسانوں کے مقامات ومدارج ہیں۔ جو اس بناء پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی۔ بعض افراد خاص اسباب کی بناء پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقام شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت واحترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے نیز ان کی قدر کو زمانی اعتبار سے چنداں پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاک دان تیرہ تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب وزینت پاتا ہے۔ جو زمان ومکان کے لوح قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں۔ لیل ونہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں۔ مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا۔ اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواجہ سنائیؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ ؎

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نادر روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھے۔ بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے دماغ کے مختلف خانوں میں حسنِ ترتیب سے چنتے جاتے تھے۔ ہر خانہ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اٹھا لیتے "تذکرہ" انہوں نے صرف حافظے کی بناء پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرمالیں۔ جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم فضل الدین۔ احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظربند ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل" کے ایڈیٹر تھے۔ طباطبائیؒ مرحوم کی شرح دیوانِ غالب میں انہوں نے سادہ اوراق لگوا لئے تھے۔ اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک ندیم نے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذرِ آتش ہو گیا۔

خدا کی خاص نعمت

"غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے مجلس احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

گفتگو میں اہل زبان کی سی روانی کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لب ولہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری

پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے۔ اور انھیں میں وہ درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے مناسبت تھی دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، علم الالسنہ، آثار قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرہ علم و فن میں وہ یگانگی کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی تھی۔ اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی فارسی اور اردو شعراء کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابل توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں نے جن اردو شعراء کے محض نام سن رکھے تھے اور ان کا کلام کبھی نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولانا کی تصانیف میں ان کے اشعار بھی جابجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں یہ تمام ذخیرے دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور ہزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے اتنی فرصت کیوں کر میسر آگئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزار لیا جن کے وجود تک سے اہل علم بے خبر ہیں۔ پنجابی زبان کی ایک کتاب "پکی روٹی" ہے جس میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیام امرتسر کے دوران میں انہوں نے وہ کتاب پڑھ لی تھی

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑ دیئے اور دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں۔ جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہو سکتا۔

"الہلال سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الا ما شاء اللہ) امرا و روسا سے اعانتی رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امرا و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجۂ امتیاز میں کوئی خلل نہ آئے "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحب ریاست نے خاص رقم کا چک مولانا کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھئے۔ اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے شکریے کے ساتھ چک واپس کر دیا اور لکھا۔

"ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسائے قوم کے جود و سخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں آئے بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے

"اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا۔ جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی۔

(صاحب "ماثر رحیمی") اور صمصام الدولہ (صاحب "ماثر الامرا")

نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آ گئیں اور خان خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی۔ اگر حادثہ رو دہد جائے نشاں و مید کہ شمارا دریابیم"۔ خانخاناں نے جواب دیا تھا " زیر لاشہ"

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ "فتح آسمانی" اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اصل میں فتح آساں نے (فتح آساں نہیں) ہو میری گذارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا۔

دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے۔ لیکن اس میں "فتح آسمانی" ہی ہے یعنی حالت ایسی ہے کہ سر و سامان کی بنا پر فتح کی امید نہیں کی جاسکتی۔ آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو۔ آساں نے "ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔ اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہوا برسوں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "ماثر الامرا" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک وہی نکلا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا۔"

کون اس حافظے کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔

یہ بہت ہی ادنٰے درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں۔ کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ اصول پیش کردیا کہ حق وصداقت کے لئے کامیاب ومنصور ہونا لازم ہے باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی سازوسامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کردیں لیکن بالآخر وہ خاسر ونامراد رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں کہ ۸ ستمبر کو دوہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جسے ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی۔ لیکن ۲۳ ہی کو داخل کردی گئی۔

ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بہ طور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن "الہلال پریس" کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے ..... بڑی فکر یہ ہے کہ جب محرومیٔ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آیندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟

قولِ فیصل

ایسی بے شمار قدریں مولانا نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بہ سلسلۂ ترکِ موالات گرفتار ہوئے تھے اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انہوں نے بھی دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا۔ جو قولِ فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔

ہیں صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اگر اس سے میری رائے اور ضمیر خریدنا مقصود ہو تو یہ ادب واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلا کی تو کیا حقیقت ہے۔ کوہ نور اور تخت طاؤس کی دولت بھی بھیج کر دیکھئے۔ تو میں آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمت و خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچایا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلب ضمانت کا خیر مقدم الہلال سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔ الہلال سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا "ابتدائے عشق" ساتھ ہی فرماتے ہیں:

"انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس اس کو چاہیئے کہ اپنے کام میں مصروف ہے

کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ خواہ ان کا مسلک و مشرب راہ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعیِ حق کی حیثیت میں صورتِ حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوتِ حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا۔ کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نفع و سود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہل ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل باریوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھی۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پہلے نمبر کے افتتاحیہ میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے موسم سرما میں ان کی چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشہ عمل کے اجزاء ۱۹۱۲ء میں آئے یعنی جو پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا۔ اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال

ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیان "قولِ فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا مجاہدین آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائد آزادی رابرٹ ایمٹ کا بیان بہت پرزور اور پُر تاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن "قولِ فیصل" کے مقابلے میں وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جد و جہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا جدی و پشتی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیر نہیں ہوا لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

مقامِ دعوت کے تقاضے

الہلال کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے "الہلال" کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولانا کے مقامِ دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیش نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ "الہلال" اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں

اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑھے تھے یا عمل میں انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشین تحریرات یا پرتاثیر خطابت تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا ۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی ۔ اس پر اونچے سے اونچے کا عمل کا نمونہ پیش کیا ۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے ۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے ۔

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد ارادہ بہت لمبا ہوگیا ۔ پر سچ ہے :-

ہمیں عشق است بر خود پیچیدہ پیرا ایں داستاں ورنہ
کسے از معنیٔ یک حرف صد دفتر نے سازد

استغنا اور بے نیازی

تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر سے ختم نہیں کر سکتا یہ ان کی شانِ بے نیازی تھی ۔ "الہلال" کے دورِ اوّل ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہوگیا تھا ۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیاز مندوں کی التجاؤں کو شرف پذیرائی بھی بخشا ۔ پھر ہر سکیم ، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر

گزر گئے۔ سینکڑوں اکابر کی رائیں بدلیں۔ ان کے مسلک و مشارب میں تغیر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے یہاں اس رائے پر بحث کا کوئی سوال نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاع عزیز انھیں جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر ماحصل حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے لیڈروں کے روبرو پیش ہوتی ہے۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے مسلک کی استقامت کے سلسلے میں بے دریغ لٹا دی۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر جس بے نظیر حوصلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں وادیوں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا۔

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدار سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا غالب بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم تیرہ ذوقی کے جس عہد سے گزر رہے ہیں۔ اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے۔ کہ مولانا کے پایے کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شئے فنا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے۔ اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا۔ جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود اُن کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغنا یہ بے نیازی تمام نیاز مندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابل ذکر متاع چھوڑی ہے۔ تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے۔ اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا۔

نذر حقیر

میں اپنے علم و نظر کی بے مائگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات تھے۔ جو بے اختیار زبانِ قلم پر آگئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں جنھیں دامن میں سمیٹ کر مولا کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذر حقیر شرف قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالبؔ کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

هند را بندہ سخن پیشۂ گمنامے بود
اندریں دیر کہن مے کدہ آشامے بود

کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا فرق ہے یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی۔ گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی جلتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سزا یافتہ اور نظر بند قیدی کی حیثیت سے جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جسے عام طور پر بے چارگی کی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ بڑی شدت کی زندگی ہوتی ہے۔ یعنی سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کی طبیعت کے پورے جوہر جیل میں کھلتے ہیں مولانا اس نظر بندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی رہنما یا پھر اس کے بعد وزیر تعلیم اور ان میں سے ہر حیثیت میں اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع۔ نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

ان خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے۔ وہ آزاد جو زمانے کو للکارتا ہے کہ مجھے رُلا کر تو دیکھ دل دردمند رکھتا ہے اور رو نا نہیں لذتِ غم کے مزے لیتا ہے۔ اور چہرے پر شکن نہیں آنے دیتا ذنوبہ تو بہ میں صیغۂ واحد غائب میں لکھنے لگا۔ ہاں تو، مولانا فرماتے ہیں:۔

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے ہو"

مولانا آزاد غبارِ خاطر کے آئینے میں

گوپی ناتھ امن لکھنوی

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ دونوں کا اندازِ نگارش جُدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی۔ اس لئے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں پھر بھی غبارِ خاطر میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے۔ اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ مولانا کے خطوط صرف ایک ہی ہستی کے نام یعنی صرف نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے۔ مولانا کے بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے

اسی انفرادیت سے مولانا میں بے پناہ قوتِ برداشت پیدا کردی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں: مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی حکایتیں لکھی تھیں۔ صبرِ گریز پا کی شکایتیں کی تھیں۔

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشین لکھیے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔"

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ۔ اپریل ۱۹۴۳ء کا تھا مولانا کی گرفتاری کے وقت بھی ان کی اہلیہ بیمار تھیں مارچ میں حالت زیادہ خراب ہوگئی اور اپریل میں رحلت فرما گئیں۔ اس درمیانی وقفہ میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کر لیں مگر مولانا کی طبع غیور نے اسے گوارا نہ کیا مولانا لکھتے ہیں:۔

"جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا درمیان کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ

اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں :۔

"تعلیمیوں کے پاس اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریک حال ہو۔ ..... زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی، دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی، لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خواب شیریں کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا ہوں۔

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من

ویں عجب کاندم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا شروع سے موقع ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔"

اس آخری جملے سے گیتا کے دوسرے ادھیائے کا یہ شلوک ذہن میں آجاتا ہے جو مہاتما گاندھی کے وظیفہ شام و سحر میں داخل تھا۔

یانشا سرو بھوتانام تسیام جاگرتی سنیمی

یسیام جاگرتی بھوتانی سانشا پشیتو منیہ

(جو تمام مخلوق کے لئے رات ہوتی ہے۔ اس میں جوگی جاگتا ہے اور جس میں تمام مخلوق جاگتی ہے اسے رات دکھائی دیتی ہے) یعنی ان منتخب روزگار کی سحر و شام عوام سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی

جہاں تک انانیتی ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں اس پر بحث کی اور اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی ادب کتنا حقیر ہے یہی نہیں بلکہ خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے۔ اس خط میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے انداز فکر کا جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔

مذہبی رواداری

مولانا مسلمان تھے۔ خاندانی عالم تھے، ترجمانِ قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن باایں ہمہ وہ کٹر ملّا نہیں تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں الٰہیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا۔ اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذات مطلق کی ہستی کے اعتبار سے، اس عقیدہ کا روشناس اُس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق نہیں رہتی۔ تشخیص اور غبار کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ

جواہر لال نہرو کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایماء سے کہی تھی۔" غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ مولانا کے کیرکٹر پر صادق آتا ہے ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا بہ غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اس انفرادیت کا اندازہ کیجئے۔

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو میں نے جس دن اپنی دُکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے ؎

در کوئے ما شکستہ دلی مے خرند و بس
بازارِ خود فروشی ازاں سوئے دیگر ست

مذہب میں ادب میں سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

یارِ فیضان ز خود رفتہ سفر دست نہ داد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا

ابوالکلام آزاد

ان میں سے چند کے نام بھی رکھ لئے تھے جس کا نام ملا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ "ایک چڑا ابڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آجائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلے کے اندر قدم رکھ سکے کئی منہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے جب کبھی فرش پر یاران شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سینہ کو جنبش دیتے ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہوتا ہے اور اڑتے ہی اچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں چاں چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظ کی جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔۔۔ فرمائیے اگر اس کا نام ملا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا اور جس چڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں۔

"ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے تعرف الاشیا بہ اضدادہا، اسے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے۔

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اسکا تمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکا کے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی سر اٹھا کے 'ہاں' کر دیتا ہو۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

9809

کہہ دیا ہے ۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اپنشدوں نے نفی ثبات کی راہ اختیار کی اور تنزیہہ کی نیتی نیتی کو بہت دور تک لے گئے لیکن پھر دیکھئے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذات مطلق) کو ایشور (ذات متصف و متشخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیاں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے ۔

کرے کیا کعبہ میں جو سر بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے ۔

مولانا کی تفسیر قرآن میں اُن کی مذہبی رواداری اپنے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے اس اعتبار سے ترجمان القرآن کا مقابلہ لوک مانیہ تلک کے گیتا رہسیہ سے کیا جا سکتا ہے ان دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا اسی خط میں مولانا آگے چل کر لکھا ہے " ہندوستان کے اپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جو تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی "!

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کٹر ملا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ۔ مولانا احمد نگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظربند کئے گئے تھے ۔ اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے

کٹے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں گاندھی جی اور مولانا آزاد کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریہ حیات افادی ہے اور مولانا کا جمالیاتی، گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں :۔

میں نے چاء کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقشِ عمل یوں جاتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔"

اس معاملہ میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے رکھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی روش دونوں کے بین بین ہے مولانا نے خود اس چاء سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کہیں گے چاء کی عادت بجائے خود ایک علت تھی اس پر مزید علت لائے ناخرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ

دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں پھر اس کی زبان کھلتی نہیں البتہ نگاہوں پر کان لگائیے تو اس کی صدائے خاموش سنی جا سکتی ہے۔

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست
تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا"

چائے سگریٹ

کھانے پینے کے معاملہ میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے گاندھی جی چائے کو زہر اور مل کی بنی ہوئی چینی کو سفید زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چائے کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دیئے گاندھی جی نے شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کو کہا ہے لیکن مولانا کو اس بات پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ جواہر لال ایسا شخص گڑ کھانا پسند کرتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لئے گڑ کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں ہے انہیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر رہ گیا"۔

گاندھی جی سفید شکر کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر نکل جاتا ہے لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چائے کے لئے جو شکر ہو وہ بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مطمئن نہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگر پھر صاف

ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں تیس چالیس برس پیشتر کے واقعات کے نقوش کبھی اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہو کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں نیز صفحہ کا رخ کہ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

محقق

محققوں کی دنیا میں بھی مولانا صفِ اوّل میں ہیں۔ قلعہ احمد نگر پہنچے تو چند صفحوں میں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ چائے کا بیان کرنے پر آئے تو اس کی تاریخ، قسمیں پینے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کیے کہ چائے نہ پینے والا بھی پورا لطف لے سکتا ہے۔ ۱۰ اکتوبر کے خط الٰہیات کا ذکر کرتے ہیں تو قدیم عقیدوں سے لے کر جدید تحقیقات تک کے حوالے دل کش اور ذہن کش انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ویدوں کے زمانے سے لے کر انشٹائین کی تھیوری تک ان کی طبع رسا کی جولانی نظر آتی ہے تمام متمدن ملکوں اور قوموں کے عقیدوں کی کہانی چند صفحوں میں بیان کرکے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہی کیفیت ۵ دسمبر کے خط میں ہے جس میں پانچویں جملے کی سرگزشت اور اس کے سیاسی اور مجلسی نتیجوں کا تذکرہ ہے۔

صاحبِ داستان

نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں":

اس پر بے ساختہ برنارڈ شاہ کی وہ بات یاد آجاتی ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی شہادت پر لکھی تھی کہ اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ نیک ہونا بھی خطرناک ہے۔

قوتِ حافظہ

مولانا نے جس طرح ان خطوں میں عربی، فارسی اردو کے اشعار اور فقروں کو جابجا نقل کیا ہے اس سے ان کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے ظاہر ہے کہ جیل میں تو ان کے پاس وہ کتابیں تھیں ہی جن کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر حوالے دیئے اور ٹھیک دیئے لوک مانیہ تلک نے جب گیتا رہسیہ جیل میں لکھی تھی تو انھوں نے بھی بہت حوالے دیئے مگر حوالوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل سے باہر چھپ کی جائے گی اور ایسا ہی ہوا یہ قوتِ حافظہ مولانا کی یک سوئی طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ وہ طوفانوں میں بھی پرسکون رہ سکتے تھے اور سیاسی ہنگاموں میں بھی اپنی ادبی شان قائم رکھ سکتے تھے یہ بڑی بات ہے جو اس عالم آب و گل میں خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اشعار اور فقروں کا برمحل حوالہ لاجواب ہے۔ اگر کوئی جواب ملتا ہے تو وکٹورین دور کے آخیر ادیب لارڈ اوبیری کے یہاں، جو پلیسس آف لائف اور پلیژرس آف لائف کے مصنف تھے۔ مولانا فرماتے ہیں :۔

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں

ابوالکلام آزاد

کی نظر کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے لیڈر کیسے بن گئے اس کا جواب ان

کی مندرجہ ذیل عبارت کے آخری جملہ میں ہے :۔

"زمانے کے بہت سے حربے میرے لئے بیکار ہو گئے، لوگ اگر میری طرف سے

رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل طمٔن ہو اور زیادہ منت گذار ہونے لگتا ہے کیونکہ

ان کا ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا

ہے۔ اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے لئے اختیار کی پسند نہیں ہوتی اضطرار

و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا

تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔"

اسی وجہ سے مولانا میں خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت کی کیفیت تھی بقول

پنڈت جواہر لال نہرو کے ایسا جامع کمالات شخص جس میں قدیم و جدید کی ایسی آمیزش

ہو اور جس میں ماضی اور مستقبل کی اتنی صلاحتیں ہوں اب پیدا ہونا مشکل ہے۔

ابوالکلام آزاد

چڑیا چڑے کی کہانی کے عنوان سے جو خطِ غبارِ خاطر میں درج ہے اس سے مولانا کی قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی دل کشی، واقعات کا مشاہدہ، ذاتی تجربہ طبیعتوں کا جائزہ غرضیکہ ان داستانوں میں ایک صاحبِ دل کا دل اور ایک صاحب نظر کی نظر دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلسفی کسطرح قدرتی مناظر کو دیکھتا ہے۔ اور ان کا لطف لیتا اور رنگینی کے ساتھ انھیں بیان کرتا ہے۔ اس کا نمونہ شاید ہی اس سے بہتر کہیں مل سکے

چند نشتر

ان خطوں میں چند چند نشتر ہیں بہ خوفِ طوالت صرف دو پیش کیے جاتے ہیں

(۱) جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔

۲۔ یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے مزگی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکوں سے اضطراب کی ہو مگر پھر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی ایک بڑی لذت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں حمضوا مجالسکم اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انھیں کو مل سکتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مولانا کی انفرادیت تنہائی پسندی علمیت اور فلسفیانہ رُخ سے زندگی کو دیکھنے

کامل نمونہ تھے جس کی مثال حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد ملنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کی غیور طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ حال کو، بلا معاوضہ، ماضی کے قرض سے گراں بار کر دیا جائے اس لئے اُن کا گوشۂ چشم ہمیشہ مستقبل کی طرف رہا ان کے خطبات اور الہلال اور البلاغ کی تحریروں اور کانگریس کی رودادوں کو پڑھئے اور ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۷ء کے واقعات پر غور کیجئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر تاریکی کے کتنے پردوں کو نفوذ کر سکتی ہے۔

گاندھی جی کے نورتنوں میں مولانا آزاد غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے، اُن کی ۶۹ برس کی زندگی میں آزادی کی جدوجہد اور اس کی بہت سی منزلیں سموگئی تھیں، اس لئے ان کی صدارت و قیادت ہماری تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی وزیر معارف اور کانگریس کے رکن رکین کی حیثیت سے کون سا فیصلہ ہے جس پر ان کا اپنا نقش نہیں یہ سب کام صرف قدیم تمدن کی گہرائی یا پختگی کی بدولت ممکن نہیں۔ جب تک اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور شامل نہ ہو۔

زندگی بسر کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اور شورش انگیز مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے مقصد اور منزل و محمل کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اور جب فیصلہ کر لیا تو اس پر سختی کے ساتھ جم گئے۔ یہاں تک کہ پہاڑ ہل گئے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ان کا مقصد بلند تھا۔ اس لئے ان کی وفا کا درجہ بھی بلند تھا۔ اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت کرتی ہے۔ اس راستے

آہ ! ابوالکلام

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

آج اگر قلم میں روانی ہوتی تو رگِ سنگ سے لہو ٹپکتا ۔
اگر فصاحت و بلاغت یوں بے جان و بے روح نہ ہوتیں تو پتھر کے دل پگھل جاتے اگر خطابت یوں خاموش اور مہر بلب نہ ہوتی تو آسمان خون کے آنسو رونے لگتا۔
لیکن ۔ آج قلم خود نوحہ کناں ہے کہ صاحب قلم نہ رہا ۔
فصاحت و بلاغت خاک بسر ہیں کہ کوئی ان کا اداشناس نہیں رہا ۔
خطابت غمگین ہے کہ اس کا رمز شناس باقی نہیں ۔
مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرہ کار صاحب قلم ، ایک فصیح و بلیغ مقرر ، ایک جادو بیان اور آتش نوا خطیب ہی نہیں آزادی کے مجاہد اور نئے ہندوستان کے معمار بھی تھے ۔ وہ اس صحیفے کا آخری ورق تھے جس کی تزئین و آرائش میں علم و فضل کی بہترین روایات شامل تھیں ۔ وہ ہندی اسلامی تمدن کی مایۂ ناز پیداوار اور اس علم و فکر کا

کا سا شور اور ہنگامہ ہے۔ جملوں میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا اور ہماری فطرت میں آگ سی لگا دی۔ لیکن یہ شاندار اور پرشکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثراتِ خارجی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس میں ادب اور لطافت کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں۔ ترجمان القرآن کے مقدمہ میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں۔

حضرت مولانا زندگی کو ایک فریضہ سمجھتے تھے جسے انجام دینا چاہئے۔ ایک بوجھ ہے جسے خندہ پیشانی سے اٹھانا چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔

حضرت مولانا "باغِ وجود" کے "ثمر پیش رس" تھے اور ان کی "نمود" میں ایک طرح کی "عزلت" تھی یعنی وہ لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر نہیں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی، مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے، ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند تھا۔

مجھے حضرت مولانا کی پابوسی کا شرف پہلی دفعہ ۱۹۴۶ء میں ہوا جب وہ احمد نگر جیل سے رہا ہو چکے تھے اور غبارِ خاطر نئی نئی چھپی تھی۔ کاظمی صاحب قبلہ ساتھ تھے وہ پھل لے گئے کہ "یاسمن سفید" پیش کریں گے لیکن ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ڈبہ کو جھاڑ کے بنائی گئی اور سب کو بطور تبرک اس دردِ تہ جام کا ایک ایک فنجان پیش کیا گیا۔ میں نے غبارِ خاطر کا

یں کیا کیا دقتیں پیش آئی کیسی کیسی سختیاں جھیلیں کسطرح کی ذلتیں اٹھائیں ۔ ان مخلصانہ قربانیوں کی داستان ہماری نئی نسل کو جو پچھلی روایات اور تاریخ سے بے بہرہ ہوتی جاتی ہے ، ایمان اور یقین کی ایک نئی دولت بہم پہنچا سکتی ہے ۔ مسلم لیگ والوں نے کون سا الزام ہے جو ان کو نہیں دیا ۔ کون سی نا ملائم بات ہے جو ان کی مخالفت میں نہیں کہی لیکن وہ ان سب چیزوں کو دریائے بے تابی کی ایک موج خون سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور تحریر و تقریر دونوں میں ہمیشہ ان کا رویہ یہی رہا کہ

آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من است

قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں ۔ لیکن موتی بننے کے بعد وہ بے پناہ ہو جاتا ہے ، اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا ہے ۔ دنیا کا طوفان اسے منتشر نہیں کر سکتا ۔ اس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں مولانا کی زندگی اس "پرافشانی نور" کی بہترین مثال ہے لیکن گوہر کو جامد سمجھنا صحیح نہیں ۔ مولانا مرحوم نے یہ نور افشانی حکمت اور بصیرت سے کی ہے جس کا ان کو بڑا حصہ ملا تھا ، ان کی زندگی میں نئے تقاضوں کا احترام اور مستقبل کی نبض شناسی موجود تھی ۔ آزادی کے بعد جس تفکر و تدبر جس دیدہ وری اور تعمیری صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی اور اس کی جھلک ان تمام نقشوں میں نظر آتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد خوب سے خوب تر کے اصول پر بنائے تھے ۔ یہی حال ان کی تحریروں کا ہے جن میں زمانہ کی نبض چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ ان کی ابتدائی نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں ۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا جلال اور شکوہ ہے ۔ الفاظ میں نقارہ و دہل

ہے، مولانا نے ذوقِ حضوری کے لئے بات میں بات پیدا کی ہے۔ اور دل کی گرمی سے عقل کی شمع کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بارِ حیات کو ہی ہلکا نہیں، بلکہ ہمارے احساسات میں بھی بالیدگی پیدا کی اور زندگی کے احترام کے نئے دروازے کھولے، وہ اپنے لمحات کو جاوداں بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور من وتو کی دنیا سے نکل کر بے کراں فضا میں پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہی ادبِ عالیہ کی شرطِ اول ہے۔

غبارِ خاطر کو پڑھ کر وادیِ کشمیر کے ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفیدار کے سیدھے سیدھے اور خوشنما درخت ہوں، لیکن الہلال اور البلاغ کی تحریریں اس تند رو دریا کی یاد دلاتی ہیں جو پہاڑوں کو چیرتا، کاٹتا اور میدانوں کو طے کرتا موج در موج سمندر میں گرتا ہے۔ KING JAMES کی بائیبل کی طرح لوگوں نے الہلال اور البلاغ کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور اس کی نثر پر سر دھنا۔ یہ ٹھیٹ مشرقی نثر ہے جس میں عربوں کی سی خطیبانہ بلند آہنگی اور ہندوستانیوں اور ایرانیوں کی سی مرصع کاری ہم آمیز ہوگئی ہے۔ اس نثر میں اردو سیاست کے تمام تیور موجود ہیں۔ فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے الفاظ میں نقارہ و دہل کا سا شور و ہنگامہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں خون کے قطرے ہیں اور ہر قطرہ پر کاوشِ خرمان کے ظلم وستم کی مہریں ہیں۔

مولانا نے لکھنا ایسے سیکھا تھا جیسے مچھلی تیرنا سیکھتی ہے۔ انشاء کے قواعد ان کے ضمیر میں اس طرح جاگزیں تھے جیسے فولاد میں جوہر، لیکن تاریخوار اگر ان تحریروں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انداز و اسلوب کا بڑا ہموار ارتقاء ہوا ہے۔ پریشان

ابوالکلام آزاد

ذکر چھیڑنا چاہا تو فرمایا " وہ تو غبارِ خاطر ہی ہے اور بس۔

غبارِ خاطر کے متعلق آپ کے نعیم صاحب ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ دار و رسن کی آزمائش میں لکھی گئی ہے اور اس امتحان کی بعض منزلیں " غزل خواں " ہی طے کی جا سکتی ہیں۔ غبارِ خاطر کا انداز کچھ اس طرح سے ہے کہ

وہ اک نگہہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

انہوں نے بساطِ دلبری پر ادائے لطف کو عام نہیں کیا۔ لیکن آپ ایک مصنف سے کیوں توقع رکھیں کہ وہ اپنی خلوت کے سب زاویے آپ کو دکھلا دے کوئی شخص اپنے متعلق پوری سچائی بیان بھی تو نہیں کر سکتا اور اگر بیان بھی کر دے تو بقول ایلیٹ اس کی تاب کون لا سکتا ہے؟ کیا روسو نے پوری سچائی بیان کی ہے سامرسٹ ماہم تو یہاں تک کہتا ہے کہ " اعترافات " میں اس کی تصویر ناقص ہی ہے!

مولانا نے یہ خطوط احتیاط کی چھلنی میں چھانے ہیں " ہر ابلِ شیشہ فرو بند " پر زور دیا ہے اور بڑے خاص حالات میں لکھے ہیں۔

خواہم از بند بہ زنداں سخن آزاد کنم
غمِ دل پردہ وری کردہ فغاں ساز کنم
بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرواز کنم

پھر بھی جا بجا التفات و تغافل کی عشوہ گری ہے اور کیا وہ بذاتِ خود دلچسپ نہیں

کے یہاں یہ بھاری معاملہ بے وجہ صرف نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اعلیٰ سیاسی مقصد تھا جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اگر یہ سلمہ ستارے کا کام یوں ہی دکھلاوے کے لئے ہوتا تو اردو کی پرکار الٹی گھوم جاتی۔ لیکن اس کے ساتھ اچھی قدریں وابستہ تھیں، اس لئے یہ نثر بھی آگے بڑھی اور اس کے ذریعہ ہماری زندگی بھی۔ اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو آزاد اپنے طرز کے موجد بھی ہیں۔ اور خاتم بھی۔ نہ وہ جانشین ہیں نہ ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قدر دل کشی کے ساتھ گلزار میں داخل ہوئے کہ سرو و شمشاد بھی شرما گئے۔ وہ جہاں ہیں تنہا ہیں۔

مولانا نئی ہندوستانی تہذیب کا محل، انسانیت اور رواداری کے وسیع تصور پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور انھوں نے اس کی بنیادوں کو سلامت روی بے لاگ صداقت، خدا پر بھروسہ اور حق کی فتح کے یقین سے بھر اتھا کی شخصیت میں ایسا حسن تناسب اور ایسی دل کش ہمواری تھی کہ وہ ہر مشکل مسئلہ کو طے کر سکتے تھے، اور ان کا ناخنِ تدبیر ہر گتھی کو بآسانی سلجھا سکتا تھا۔ کتنا ہی ٹیڑھا اور الجھا ہوا معاملہ کیوں نہ ہو، تھوڑی سی گفتگو کے بعد حقیقتِ حال ان کی گرفت میں آجاتی تھی اور جب وہ نکتہ کو پکڑ لیتے تھے تو پھر اس کو چھوڑتے نہ تھے۔ معاملہ کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بات ذہن نشین اور خاطر نشان نہ ہو جائے معمولی سعادت نہیں۔

ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیتیں انسانیت اور رواداری ہیں۔ مولانا میں یہ خوبیاں صفت کے طور پر نہیں آئی تھیں ان کی ذات کا جزو تھیں، انہوں نے اسلام سے اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ اس لئے ان کے تخیلات کی جڑیں دور تک چلی گئی تھیں اور اس لئے اس ورثہ کی جھلک ان کی

دار اور پُرشکوہ نثر الہلال والبلاغ تک رہی جو صحافت سہی لیکن اس نے تخلیقی سرحدوں کو چھو لیا ہے ۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثراتِ خارجی کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں ادب کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں خطبات میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے اور یونانی اور عربی اصولوں کی پوری پابندی جو انہوں نے منبر پر کھیں وار پر برتی ہے لیکن ترجمان القرآن کے مقدمے میں جو سادگی اور پُرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوثر وسلسبیل کی موجیں ہیں جو بہہ نکلی ہیں ۔

مجھے بی بی سی کی وہ بحث یاد ہے جب آپ نے نثر کا سخن گسترانہ ذکر چھیڑ دیا تھا ۔ درحقیقت ہماری نثر ایک بچہ کی طرح ہے جو نیا نیا چلنا سیکھ رہا ہو وہ کئی دفعہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور کئی دفعہ گری ہے ۔ نظم کے برابر اس نے مدارج طے نہیں کئے ۔ غالب نے محمد شاہی روشوں کو ترک کیا اور اسکے اصلی جوہر کو چمکایا ۔ لیکن رجب علی بیگ سرور نے آئینہ خانہ میں رنگینیاں قائم کیں ۔ وہ بے ناپ تول لکھنے کے قائل ہی نہ تھے ان کی انشا فارسی کے حسنِ مستعار سے چمکی ۔ ایسا نظر سوز حسن جس میں اس کے اصلی خط وخال ہی چھپ گئے ۔ حالی کے یہاں آب ورنگ غیر ضروری تھا اسی لئے رات کا غازہ اور نرگسی آنکھوں کا سرمہ بڑے اہتمام سے دھو ڈالا گیا ۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے پھر ادبی مرصع کاری کا آغاز کیا ۔ یہ اسی قسم کی کوشش تھی جیسی (بلا تشبیہ) ڈرائیڈن کے زمانے میں جانسن نے یا ہبرلسٹ کے زمانے میں کارلائل اور ڈی کوئنسی نے کی تھی یہ گویا عزیز ماہی کی زبان میں بھاری بھاری تلوان اور نگن لے جوڑے ہیں یا سونے کے جڑاؤ اور سچے موتیوں کے گہنے " لیکن مولانا آزاد

اگر دس سال کا تو درخت بوؤ، اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسانوں بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے، انہوں نے اپنے اعجازِ عمل سے تاریخ کی تخلیقی رو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتب عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویند پس از ہزار سال از عالم
روشن جاتے ز آسمان زیر آید
خاقانی ازیں جنس دریں دہر مجو
بیرہ منشیں کہ کارواں دیر آید

زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی یہ بڑائی ہے کہ ان کا تعلق صرف ماضی ہی سے نہیں حال اور مستقبل دونوں سے ہے، اس لئے ان کے کارنامے زندہ رہیں گے اور ان کے کارناموں کی پرچھائیاں نئے ہندوستان میں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں، لیکن جو چیز مجھے رہ رہ کے یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسنِ تناسب اور اس کی دل کش ہمواری ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آن جہانی تصوریں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں اور دنیا کیطرف توجہ کی تو بس اسی کے ہو گئے PASCAL کو حیرت تھی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہوکر شاہد و شعر پیامے درامش و رنگ و بو میں محو ہو جاتے ہیں۔

(THEY) DANCE AND PLAY. THE LUTE AND SING AND MAKE VERSES

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گرد وپیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کسطرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت ضائع کر سکیں۔ مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش تھی اور بڑے صحیح تناسب کے ساتھ انہوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انہیں لینا چاہئیے تھا۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے انسانیت اور روا داری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزوست" کے سلسلہ میں ایک چینی مقولہ پیش کرنے لگے کہ اگر تمہیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ

گنج کا علاقہ فخر کر سکتا ہے اور قدیم تعلق پر پنڈت کا کوچہ اور سارا لال کنوئیں کا علاقہ۔

پنڈت کے کوچے سے دو عظیم شخصیتوں کو نسبت ہے۔ ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ایک مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا مودودی کا اپنی وزنی تصنیفات اور اپنی منظم جماعت اسلامی کے باعث دنیائے اسلام میں شہرہ ہے۔ اور مولانا ابوالکلام سید عبدہٗ مصری اور جمال الدین افغانی کی صف کے فاضل ہیں فارسی کی مثل ہے" یک من علم را دہ من عقل درکار است" مولانا کے پاس دس من نہیں سو من عقل موجود تھی۔

تحریر و تقریر کے مولانا بادشاہ ہیں ان کا اخبار "الہلال" کا مسلمانانِ ہند کو جگانے میں سب سے زیادہ حصہ ہے اور جس انداز سے انہوں نے سوتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا تھا اس انداز سے جھنجھوڑنا دوسرے کے لئے ممکن نہیں ہے ان کی زبان اور ان کا طرزِ بیان کوئی کہاں سے لائے گا معلوم ہوتا تھا کہ عرش کا پایہ پکڑ کر لکھ رہے اور بول رہے ہیں۔

تقریر میں مولانا اور لیڈری کرتے تھے ۱۹۱۱ء میں ایک بوڑھے اور تجربہ کار شخص عبداللہ خان دلّی کے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ میرے مکان سے ملا ہوا ان کا مکان تھا انہوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا ابوالکلام تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں۔ جس دن چاہیں غدر کرا سکتے ہیں۔ ایک پولیس والے کے نزدیک کسی کی اہمیت کا اس سے بڑا معیار نہیں ہو سکتا۔

غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت شعور آگیا تھا اس شعور کے بیدار کرانے والوں میں مولانا کا نام امتیازِ خاص رکھتا تھا۔

تدبیر اور سیاست دانی کی یہ کیفیت ہے کہ آج سے بیس برس پہلے ایک ذمہ دار بزرگ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجہ ذیل الفاظ سنائے تھے۔

فخرِ دہلی

ملّا واحدی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مکّہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ہندوستان آکر بھی دلّی سے باہر رہے۔ لیکن ان کے والد حضرت مولانا خیرالدین دہلوی تھے۔ پنڈت کے کوچہ میں رہتے تھے مولانا ابوالکلام خود بھی شروع شروع اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھا کرتے تھے۔ "محی الدین المسکنے بہ ابوالکلام آزاد دہلوی" لکھنا بھی بہتوں کو یاد ہوگا۔ مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر آہ بھی دہلوی لکھتے تھے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ میں مولانا ابوالکلام کو دلّی والوں میں شامل نہ کروں اور دلّی کو اس شرف سے محروم رکھوں کہ اسے مولانا جیسے فاضل، ادیب مقرر اور مدبر سے نسبت ہے۔ ویسے بھی آدھی عمر کے بعد سے مولانا کا زیادہ وقت دلّی ہی میں گزرا ہے اور میں صرف دلّی والوں کا ذکر نہیں کر رہا اپنے زمانہ کی دلّی کا حال لکھ رہا ہوں میرے سامنے دلّی کو جن جن سے واسطہ پڑا وہ سب "میرے زمانہ کی دلّی" میں آئیں گے۔ مولانا نے دلّی میں بیٹھ کر کام کئے ہیں۔ کام کی نسبت مولانا ابوالکلام کو دلّی سے زیادہ تعلق رہا ہے ایک زمانہ میں دریا گنج والی حکیم عبدالحمید مالک ہمدرد دواخانہ کی کوٹھی لے رکھی تھی اس قیام پہ دہلیا

عقیدت کے آنسو

مولینا عبدالرزاق ملیح آبادی

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

کہہ رہے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد ہم سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

کیوں نہیں؟ مولانا پر ان گنت الٰہی رحمتیں ہمیشہ برسا کیں۔ برستی ہی چلی گئیں اور آخر میں مولانا کی خود ذات ہی رحمت الٰہی بن گئی۔

یہ مرتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا۔

لیکن میرا عہد ہے۔ اپنے ضمیر سے، اپنے مولانا سے، اپنے خدا سے کہ جیتے جی مولانا کو نہ "مرحوم" کہوں گا، نہ مرحوم لکھوں گا!

غافل دنیا، کیا مولانا سچ مچ مر چکے ہیں؟ کہتے رہو، لیکن جانتا ہوں، یقین سے جانتا ہوں کہ مولانا مرے نہیں ہیں۔

ابوالکلام آزاد

میں صرف گاندھی جی کی سیاست ہی نہیں جانتا سیاست کا اسکالر بھی ہوں۔ سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں اور کسی نے نہیں پڑھیں۔ پھر تیسرے چوتھے سال میرا یورپ کا چکر ا ہو جاتا ہے۔ جہاں سیاست کی رفتار قریب سے دیکھنے میں آجاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے سیاست کا تازہ ترین علم ہو گیا لیکن جب ہندوستان پہونچ کر مولانا ابوالکلام سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی آگے ہیں۔

اس روایت کے راوی سے میں نے کہا آپ جانتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنڈت جی انسانوں کی تراشیدہ سیاست کے ماہر ہیں اور مولانا قرآنی سیاست کے قرآنی سیاست میں ہیر پھیر نہیں ہے۔ لا تبدیل لکلمات اللہ

میں نے مولانا ابوالکلام کی فراست کی مولانا محمد ایوب کی فراست سے کم تعریف نہیں کی ہے۔ مگر دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے خاندان کے لوگ اگر دہلی میں طویل عرصہ قیام کے باعث دہلوی کہلا سکتے تھے۔ تو اب جب کہ مرحوم مولانا جامع مسجد کے سامنے اور شہید سرمد کے پڑوس میں مستقل طور پر قیام فرما ہیں پھر تو یقیناً دہلی کو آپ کے وطن ہونے کی دوامی عزت نصیب ہوگئی اور اس عزت پر دہلی جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

ہاں بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم سے ذرا اوجھل ہو گئے ہیں۔ آسمان کے سورج نے زمین کے "سورج" سے خوشامد کی! کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے ہم سے بھی کچھ سرگوشیاں ہو جائیں!

ستارے اتر کر راہ میں بچھ گئے۔ دھنک کی سواری حاضر تھی۔ کہکشاں نے رکاب تھام لی، اور مولانا ہم سے چھپ گئے!

اور یہ کوئی عجیب، انوکھی، ان ہونی بات بھی نہیں۔ مولانا اپنی مادی زندگی ہی میں حقیقت کبریٰ کے اِس سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ چکے تھے۔ اِس ماجرے کا کچھ حال خود مولانا کی زبان سے سنئے، حالانکہ ہر لفظ کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔

"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے۔ اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمے سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ہشیاری و بینش کا مرقع تھا۔ بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا۔ پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی۔ پتھروں نے اللہ اللہ کر اشارے کیئے۔ خاک پامال نے اڑاڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھالنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں فرشتوں نے بازو تھامے کہ لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے سب نے نقاب اتار دیئے۔ سارے پردے چلمن ہو گئے۔ سب کی ابروؤں میں اشارے تھے۔ سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔ سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے لیئے دراز تھے۔ بادل کو پکڑا، تو سازِ ہستی کا طنبورہ نکلا بجلی کو پاس بلایا، تو لب ہائے راز کا ایک تبسم

ہاں، ہاں دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ایک مزار بھی بن چکا ہے۔
مرجع خلائق بھی ہو چکا ہے خود یہ بدنصیب آنکھیں بھی۔ کاش آنکھیں ہی نہ ہوئی
ہوتیں۔ اس قبر پر آنسو بہا چکی ہیں، اور زبان سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی۔

تنہا گئے کیوں! اب تنہا رہو کوئی دن اور!

اور پھر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی جس کا کسی زبان میں کوئی نام نہیں:-

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں

مگر میرے لئے تو مولانا مرے نہیں ہیں۔ یہ دیکھو، میرے دل کی آنکھوں کے سامنے
جیتے جاگتے بیٹھے ہیں۔ اسی شان سے، اسی سنجیدگی سے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ بیٹھے
ہیں۔ وہی من موہن مکھڑا ہے۔ وہی ہشاش بشاش چہرہ ہے، ہونٹوں پر وہی دلفریب تبسم
کھیل رہا ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں پھول جھڑ رہے ہیں۔ موتی ہیں کہ بکھرتے چلے جا رہے
ہیں۔ ادھر نرم نرم زبان ہے۔ ہاں ہوں ہو رہی ہے۔ ادھر فصاحت و بلاغت کے
سمندر ہیں کہ پڑے موجیں مار رہے ہیں۔

تو اب خدا را کوئی مجھے بتا دے کہ اپنے آپ کو، اپنے دل کو اپنے ضمیر کی آنکھوں
کو جھٹلا دوں تو کیوں کر جھٹلا دوں؟

دوستو، مولانا مرے نہیں ہیں، مر سکتے بھی نہیں، مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے
تھے۔ زندہ ہیں، زندہ رہیں گے۔ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ میرے دل میں زندہ رہیں گے
تمہارے دل میں بھی زندہ رہیں گے سارے جہاں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

لینے والے بھی اور سانس نہ لینے والے بھی، سبھی کے لئے موت مقرر ہے، حتمی ہے، اٹل ہے،

یہ سب سچ ہے۔ حق ہے۔ شک سے بالا ہے، مگر کیا نفوس قدسیہ بھی مرجایا کرتے ہیں؟ کیا ابراہیمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ مر چکے ہیں؟
کیا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسین ابن علیؓ پر موت چھا چکی ہے
کیا اب ہمیں جنید بغدادیؒ، اویس قرنیؒ، سری سقطیؒ، ابن ادھمؒ، محی الدین چشتی کہیں دکھائی نہیں دیتے؟
کیا یہ واقعہ ہے کہ خالد بن الولید، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد، اور خود ہمارے اپنے زمانے کے سید احمد شہید، محمد علی جوہر فنا ہو چکے ہیں؟
نہیں ہرگز نہیں۔ نفوسِ زکیہ میں سے کسی نفس پر بھی موت کبھی طاری نہیں ہوئی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ موت کی مجال ہی نہیں کہ اپنا بے رحم ہاتھ نفوس قدسیہ کی طرف بڑھا سکے!
بات یہ ہے کہ راہ حق کے مسافر، انسانیت کے علم بردار، علم و فکر کے معلم مرتے نہیں۔ مر جائے تو علم بھی مر جائے۔ فکر بھی ناپید ہو جائے۔ انسانیت ہی کا خاتمہ ہو جائے۔
طاغوت کی کوشش رہی ہے کہ امر انسانوں کو مار ڈالے۔ زمین کے نور کو بجھا ڈالے سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا گیا، افلاطون کو بے وطن ہونا پڑا، ابراہیم خلیل اللہ کو دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا۔ حضرت مسیح کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ مگر کیا یہ برگزیدہ ہستیاں مر کھپ چکی ہیں، مٹ گئی ہیں؟ فنا ہو چکی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہزار بار ہرگز نہیں، انسانیت کے علم بردار، علم و معرفت کے پیام بر، بشری رفعتوں کے معمار آج بھی زندہ ہیں، اپنی

آشکارا نکلی۔ ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آگئے۔ مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کر دیں۔ مگر پھر بھی ہمارے ہاتھوں کا پیالہ نہ بھرا۔ رات معدوم تھی۔ ظلمت کی بڑی ڈھونڈھ ہوئی مگر نہ ملی۔ خواب غفلت کا لاکھ پتہ پوچھا مگر کسی نے نہ بتلایا۔ جب کبھی آنکھیں بند کیں، تماشے دیکھے۔ جب کبھی کان بند ہوئے صداؤں اور نواؤں سے بھر گئے

سورج نے کہا۔ دو لاکھ میل دور ہوں، قطب شمالی سے روشنی اتری اور بولی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ نوّے ہزار میل طے کرتی ہوں، مگر آنکھوں نے کہا، یہ تو تارِ نگاہ کی منزلِ اول ہے اور دل ہنسا کہ اپنا پیامِ محبت جب شوق کے پردوں میں اُڑتا ہے، تو بھلا روشنی کی لنگ پائی کب اس کا ساتھ دے سکتی ہے! غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے ارمانوں کے ساتھ واپس آگیا، عالمِ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے۔ اس میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کی ابرو پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ نہ ہو۔ سب کی زبانیں گویا سب کے اشارے آشکارا۔ سب کی سطریں ابھری ہوئی تھیں نہ کوئی لب بیدر رہا نہ کوئی جلوہ مستور نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں چشم و گوش نے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے؟

"اللہ اللہ، دولتِ سعادت و قبولیت کی فراوانی سبحان اللہ بخشش و لطفِ یقینی کی بے پایانی! سمندر اس کی وسعت فیض کا ایک قطرہ، مگر یہ گستاخی ہے، سورج اس کے انوار کرم کی ایک شعاع، مگر یہ بھی نادانی ہے؟

بات یہ نہیں کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ "پر ایمان نہیں" ایمان ہے، پکا ایمان یقین ہے، حق الیقین، عین الیقین، مشاہدہ ہے، عمر بھر کا مشاہدہ، بے شک سانس

رشتہ ہی ٹوٹ گئے، اور وہی برطانیہ عظمیٰ جو ہمیں ہڑبڑ کا گلہ، یا گاجر مولی سمجھنے کا عادی چلا آرہا تھا، ہمارے خوف سے کپکپانے، تھر لرنے لگا!

یہ صورت قیامت کس نے پھونکا؟ ابوالکلام کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ سنئے تو:

میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سر گشتگان خواب موت، بیدار ہو جائیں؟ آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو درد ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ امت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار، اس برباد شدہ قافلے کے نالہ ساز؟ اس صف ماتم کے فغاں سنج اور اس کشتی طوفان کے مایوس کن مسافر جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش: روتے ہیں یا مایوسی سے چپ و راست نگراں، مگر نہ ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے، نہ پاؤں میں حرکت نہ ہمتوں میں اقدام، نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں، اور اہلِ شہر رونے میں مصروف ہیں ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیئے اور گھر والے سوتے ہیں۔" (الہلال)

اور سنیئے۔

"آہ تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اُتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کر تمہاری روحیں پلٹ جائیں، اور تمہاری غفلت

زندگی میں جیسے زندہ تھے، اس سے کہیں زیادہ توانائی و شادابی کے ساتھ اس وقت بھی زندہ ہیں اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں قیامت تک زندہ رہیں گے۔ انسانی ہیروؤں پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو خود خدا کے ساتھ زندہ رہیں گے، کیوں کہ خدائی علوم کے وارث ہیں۔

اور مولانا ؟ اللہ اکبر! مولانا نے ہمیں کیا نہیں دیا۔ موت کی سی بے حسی ہم پر چھائی ہوئی تھی اجنبی حکومت کی غلامی پر فخر کرتے تھے۔ انگریز کی وفاداری ہی میں اپنی قومی زندگی یقین کرتے تھے برطانیہ کو سب سے بڑی "اسلامی سلطنت" کہا کرتے تھے۔ سیاسیات میں صفر تھے اور ہندوستان میں ہماری حیثیت، بے بس غلاموں، بے شعور چوپائیوں سے زیادہ نہ تھی۔

اور ہم مسلمان ہی کہاں تک تھے؟ قرآن کو جزدانوں میں لپیٹ کر گھروں میں رکھنا ہی ہمارا اسلام تھا۔ یا پھر اندھی تقلید تھی۔ ٹونے ٹوٹکے تھے، قبریں تھیں مزار تھے، پیران ریاکار کے جال تھے ڈھیل دجالوں کے چنگل تھے۔

زمانے کی ضرورتوں سے ہم بے خبر تھے، باخبر ہونا بھی نہیں چاہتے تھے، حد یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے بھی غافل تھے بس "سلطان روم" کو جانتے تھے، اور بچپن میں "سلطان روم کے ہاتھ کٹ جانے کے بعد پھر سے نکل آنے پر" عش عش کیا کرتے تھے!

دفعتاً ایک صور کی زلزلہ انگیز آواز نے نیند کے ماتوں کو دہلا ڈالا اور ہم آنکھیں ملنا بھی بھول کر دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ہم مسلمان تھے۔ انسان تھے!

اسلام کا درد پیدا ہو گیا۔ دین کی محبت جاگ اٹھی، وطن کی عزت و عظمت کے جذبے سے ہم بھرپور ہو گئے جہاد کے ولولوں نے ہمارا خواب و خور حرام کر دیا۔ اسلامی دنیا سے

مگر اس شرف و عزت کی کیا یہی سزا مقرر تھی کہ ماتم بھی کروں ۔خدارا اس بدنصیب کو ذرا سا سہارا دے دو ۔مجھے کچھ کہنا ہے مگر کہوں تو کیا کہوں دم بخود ہوں سرنگوں ہوں، نہ جانے کیا کیا کہنا ہے ، لیکن اس وقت کہنا چاہتا ہوں بھی تو کیا کہہ سکتا ہوں "ایاز! قدر خود بشناس!

غافل، ان مرطلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے ۔

ابوالکلام کی نسبت زبان کھولنے کا حق صرف ابوالکلام ہی کو ہے ۔

کاش یہ زبان پہلے ہی گنگ ہو چکی ہوتی اور قلم ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا لیکن دل میں جوش ہے ۔ بے پناہ جوش مولانا سے پہلے ہی گستاخ تھا ، اب پھر گستاخانہ مگر درد بھرے دل سے کہے بغیر رہا نہیں جاتا ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

تنہا گئے کیوں ؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مولانا! کیا عہد تھا ؟ آپ تو قول کے دھنی بات کے پکے وعدے کے پورے تھے، پھر یہ ناگہانی فراق کیسا، میں بھی جانتا ہوں آپ بھی جانتے ہیں۔ خدا بھی جانتا ہے کہ پچھلے اڑتیس سال کی رفاقت میں ایک لمحہ بھی بے وفائی میرے پاس نہیں پھٹکی پھر مجھے اور اپنے سب چاہنے والوں کو چھوڑ کر آپ کیسے چلے گئے؟

اچھا مولانا ، آپ مسکراتے ہیں ! ہمیشہ کی طرح کہئے نا ، "مولوی صاحب آپ بڑے سادہ لوح ہیں !" جی ہاں بڑا نادان ہوں کہ ابھی تک سانس چل رہی ہے ۔ مگر کیا آپ بھول گئے ۔ حالانکہ آپ کبھی بھی کچھ بھولتے نہ تھے ، کہ محبت نادان ہوتی ہے نادان ہی رہے گی محبت کے ساتھ دانائی نہ جمع ہوئی ہے ۔ نہ ہو گی ۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا ۔

مرجائے یہ کیا ہوگیا کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہوگئے ہو، اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے ہو اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔"

ابراہیم علیہ السّلام فرد واحد تھے۔ مگر پوری ایک امت بھی بہت بڑی امت، پوری انسانی امت اِنَّ اِبْرٰاهِیْمَ کَانَ اُمَّةً وَّاحِدَةً" اور فرد واحد ابراہیم سے نہ جانے کتنی امتیں پھوٹ نکلیں، اسی شجرۂ طیبہ ابراہیمیہ کی ایک شاخ مولانا آزاد بھی تھے۔ فرد واحد تو تھے۔ مگر اپنے وجود میں پوری ایک امت رکھتے تھے۔ اور اس امت کو پیدا بھی کر گئے۔

تو اب بتاؤ، ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں مولانا ابوالکلام مرگئے ہیں اور وہ آواز خاموش ہو چکی ہے جو پورے پچاس برس ہندوستان میں اور ساری اسلامی دنیا میں زلزلوں پر زلزلے ڈالے رہی ہے وہ زبان ساکت ہو چکی ہے، جو علم و حکمت، شعر و ادب، معارف الٰہیہ کے موتی بکھیرتی رہی ہے؟

کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں!

لیکن وائے افسوس، دل چاہے یا نہ چاہے اس واقعہ سے تو انکار بھی ممکن نہیں کہ مولانا اپنے مادی جسم میں آج ہم میں موجود نہیں۔ یہ تو کیسے کہوں ہم سے روٹھ گئے ہیں۔ روٹھ جاتے تو ہم بدبخت واقعی اس سزا کے مستحق بھی تھے۔ مگر وہ کوہ وقار، پیکر عفو و حلم، روٹھنا، بگڑنا، برہم ہونا طیش میں آجانا جانتا ہی نہ تھا، وہ تو عفوِ مجسم تھا، حلم و کرم کا نمونہ تھا۔

سھل الخلیقة لاتخشیٰ بوادرہ تزینه الاخنان! الحلم والکرم!

مگر دیکھو تو! اس بدنصیب شخص کو دیکھو تو! سچ مچ سب سے بڑے بدنصیب شخص کو دیکھو تو آج بھی شخص مولانا پر نوحہ خوانی کرنے بیٹھا ہے۔ ہاں ہاں ساتھ رہا ہے۔ بہت لمبا ساتھ رہا ہے

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

محمد اجمل خاں

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے راتوں رات ہندوستان ہی کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دیا" والا رزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگریس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابی (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ اس لئے وہ گھر ہی پر رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں کہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا کہیں کا پتہ نہ چلا۔ ریفرشمنٹ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست

ابوالکلام آزاد

آہ مولانا۔ آپ کے بعد جانتے ہیں کیا ہو گیا ہے

مگر یہ۔ گویا نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسمان ہے آب!

(ماخوذ از آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی۔)

کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے غالب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے خطوط سیاسی نہ تھے۔ یعنی نہ ان میں منطقی منشکی کے ساتھ تاریخی حقایق سے نتیجے نکالے گئے تھے۔ نہ قربانی کے فلسفے پر لکچر تھے۔ اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا سکتا تھا۔ نہ یہ لوگ اس طرح کے تھے کہ خفیہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے وہ سب مہاتما جی کے بتائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی "مقصد کے ساتھ ساتھ ذرائع مقصد" بھی پاکیزہ و مناسب یا جائز ہوں۔ نوجوان طبقہ اس اصول کو مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جن اصولوں کو ہمارے بڑے بوڑھے (یعنی ورکنگ کمیٹی کے ممبر) ناجائز سمجھتے ہیں۔ وہ اگرچہ عام حالات میں ناجائز سمجھے جائیں۔ مگر مقصد کی پاکیزگی انھیں بھی پاکیزہ بنادیتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا برا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مگر اس ہاتھ کی بدولت سوسائٹی کا مسلسل نقصان ہوتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نامناسب سمجھا جائے گا۔ یا اگر خود اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا ڈاکٹر کی رائے ٹھکرائی جائے گی۔ بہر حال یہ لوگ خفیہ کارگزاری کے خلاف تھے اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

مجبوراً مولانا نے خطوط لکھنے شروع کئے۔ جواہر لال جی نے "ہندوستان کی تلاش" شروع کردی۔ اور جب اس نے مولانا کے خطوط کو شائع کیا تو بہت سے ادب نوازوں نے یہاں تک کہنا شروع کیا کہ کاش یہ لوگ سیاست میں نہ پڑتے اور عمر بھر قید و بند میں رہتے تاکہ ایسے ایسے تاریخی و ادبی شاہکار تیار ہوتے رہتے۔ دیکھا آپ نے ان کے خود غرضوں کو! یہ لوگ تو جیل سے باہر رہ کر دماغی عیش کرتے اور لیڈر بیچارے دیواروں سے سر پھوڑ کرتے۔ نوواں کی قید ایک پیغام تھی۔ جس نے پورے ملک کو یہ دعوت دی تھی کہ

نکالی۔ جس میں میرا نام نہ تھا۔ لہٰذا گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی ہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ حاضری لی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر والنٹیروں اور والنٹیرنیوں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا رزولوشن سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضا کاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے۔ ہم (ارونا جی اور میں) وہاں پہنچے۔ ارونا جی نے جھنڈا لہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے دخانی توپوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ ننھے ننھے رضا کار بچوں۔ لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گولہ باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تھلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی " جھنڈا اونچا رہے ہمارا " ختم کیا اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نہتے راہ گیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی مع کچھ اور لوگوں کے پہنچ گئیں۔ بیہوش لڑکیوں کو اسپتال بھیجنے کا انتظام ہونے لگا۔ اور لاشوں کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔ آخر وہ قیدی کیوں اپنی بےبسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں؟

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھئے کہ اپنے دلی بوجھ

اگر ہم نثر مقفیٰ، وعاری، مریاں وغیرہ کی صوری صنعت گری سے قطع نظر کرلیں تو معنوی حیثیت سے حسرت کی تبویب نثر پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً سالکانہ (دسیارحانہ، ظالمانہ یا عاقلانہ) عالمانہ (مؤرخانہ، ناقدانہ، فلسفیانہ حکیمانہ یا مجنونانہ (مثلاً) - بک رہا ہوں جنون میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

غاویانہ، مجنونانہ، انکانہ، الشعراء یتبعھم الغاوون)، ناصحانہ (مشفقانہ، دوستانہ، بے ہیانہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، نالہ پابند نے نہیں ہے)۔ اسی کی ایک قسم بڑبڑانہ بھی ہو سکتی ہے۔ خامشانہ (یعنی وہ کلام جس کا جواب خاموشی ہو) خاموشی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ سوال ہی طفلانہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جواب کیلئے مسائل کی بصیرت وعلم اونچے درجے کی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ جواب نہ دینے میں کوئی مصلحت ہو۔ چوتھے یہ کہ جواب دینے سے فتنہ بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ اسی لئے ایک محاورہ بن گیا ہے کہ گنواری گالی ہنس کے ٹالی۔ بہرحال

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

ذیل میں ہم چند خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں جو دوسرے نے مولانا کو لکھے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں۔ بعض کے دو حرفی ہیں۔ اور بعض کے متعلق خموشی ہی جواب ہے۔ ان خطوط میں آپ کو "غبارِ خاطر" کے خطوں کا لطف تو شاید نہ آئے۔ اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں۔ اور بالارادہ "غبارِ خاطر" کو ادبیات کے حکم میں غرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں۔ جن میں مولانا کے فیصلے نہ صرف ناطق ہیں بلکہ محترم ہیں۔ یہ خط انہیں پیش کئے گئے اور پیش کرتے ہی ان کے جواب برجستہ اور بے تکان دیئے گئے۔ جواب دینے میں ایک لمحے کا تامل نہیں ہوا۔ ان

آں رازکہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

الہلال، والبلاغ نے مسلسل یہی دعوت دی تھی "ہری جن" کا یہی پیغام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان لوگوں کی گرفتاری کی صبح کو جو ہفتہ وار "ہری جن" نکلا تھا وہ پانچ پانچ روپے میں بک گیا اور پھر ڈھونڈے نہ ملا۔ اس میں پیام عمل تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزارہا نوجوانوں نے سینے پر گولیاں کھائیں۔ اور آخر کار حکومت برطانیہ مجبور ہوئی کہ اپنا بستر سنبھالے QUIT INDIA زندہ باد۔

مولانا نے اپنی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے ہزاروں خط لکھے اور لکھوائے ہونگے ان خطوں کی الگ الگ نوعیتیں کی جا سکتی ہیں۔ مولانا شاعر نہیں کہے جا سکتے، لیکن آپ کے ادبی خطوط کی نثر میں جو شعریت پائی جاتی ہے وہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے، ہاں۔ انھوں نے جو خط بہ حیثیت ادیب کے نہیں لکھے ان میں ہر صنف کا خط ظاہر کرتا ہے کہ کاتب مدبر ہے۔ مبلغ ہے۔ فقیہہ ہے، دوست ہے، بزرگ ہے، یا کیا ہے

حسرت موہانی نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں۔ جس کلام میں آمد ہی آمد ہو وہ عاشقانہ عارفانہ یا فاسقانہ ہوگا۔ جس میں آورد ہی آورد ہو وہ ماہرانہ، ناقدانہ یا ضاحکانہ ہوگا۔ جس میں آمد و آورد مخلوط ہو وہ شاعرانہ، واصفانہ یا باغیانہ ہو سکتا ہے۔ ضاحکانہ کلام میں اگر ابتذال ہو تو وہ سوقیانہ ہو جائے۔ اور فاسقانہ کلام میں جذبات ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر حملہ ہو اور سوسائٹی کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے

ابوالکلام آزاد

ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء
میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲-۱۹۴۴) کابل میں تھے اور وہاں انھوں
نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں وہ انقلابیوں یعنی مولانا برکت اللہ
اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔
مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم پرائم منسٹر تھے جنہوں نے ۱۹۲۷ء میں کیلیفورنیا میں وفات پائی)
مولوی محمد بشیر صاحب، امیر مجاہدین سرحد وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور
یونیورسٹی میں فرینچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلّے وزیر خارجہ تھے (جو برلن
میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آجکل رکن پارلیمان ہند
ہیں) حکومت کابل، آریانہ اور انقلابیان ہند کے روح رواں تھے۔ اقبال شیدائی۔
صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد
نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں۔

یہاں علم تنجیم یا جوتش کا خیال آگیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان
میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر و ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر
ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور) پروفیسر اقبال علی شاہ (میرٹھی۔ مصنف) اقبال شیدائی صاحب
انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائیکورٹ)، اقبال سنگھ (کرکٹ).....

بسمہ اللہ تعالیٰ

۱۲ جون ۵۶ء

سیدی و مولائی۔ اسلام علیکم و رحمۃ اللہ

میں سیاسی خطوط نہیں ہیں۔ اور مشتے نمونہ از خروارے ہیں جنہیں موقع ملنے پر شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کر دیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (رسال۔ ایم۔ پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوڑا بھیج دیئے گئے تھے۔ اور ۱۵ جون ۴۵ء کو رہا کر دیئے گئے تھے۔

رام لواس

بانکوڑا

۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء

صدیق العزیز — جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ آج صبح مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں آج رات کو ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار ایکسپریس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے۔ کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آ جائیں، امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہو گئے ہونگے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں۔ افسوس ہے کہ بہ اطمینان گفتگو کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگے ——— والسّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خطوط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ

ابوالکلام آزاد

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا۔ ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں چلا جاؤں
وہاں پرانے دوست بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں۔ آخر
دن کٹی کرنا ہے۔ فی الحال مدنظر کوئی خاص مقصد نہیں۔ یعنی سب اسی خدا کرے کچھ تجارتی کام
چل نکلے۔ دعا فرمائیے گا۔

یہاں مسٹر ڈیسائی ہائی کمشنر اتفاق سے مل گئے۔ ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمت
عالی میں بھیج دیا۔ استاد مرحوم کا مرید ہوں یعنی سہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

والسلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

یہ وہ خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصد حیات ہی حرکت و ہیجان ہے۔
جس نے اپنے قید و بند کے زمانے میں جیلروں تک کو انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا۔
وہ ایک کوہ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم رہے۔
شمع حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے! مولانا کے
بعد۔

ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں!

یہ غالباً تیسرا مکتوب ہے جو خدمتِ عالی میں ارسال کر رہا ہوں اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جواب تاریخی واقعہ ہو چکا ہے ارسالِ خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے باعث دلچسپی ہوں ایک اور صحیفہ بھی ہے جو مولوی فضل الہٰی صاحب مرحوم و مغفور نے ہر ہٹلر مرحوم اور موسولینی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی دوسرے وقت میں ارسال کرونگا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

حضور کے جواب کا ایک مدۃ سے منتظر ہوں: تاخیر غالباً گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کرونگا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسول الکریم

قاہرہ ۔ ۴، اکتوبر ۱۹۵۱ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ: سلام مسنون۔ مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے میرے عدن سے مکتوب کا جواب دیا۔ کہ حضور میرے لئے دست بدعا ہیں کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو۔ شکریہ۔ مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے: بہر حال مایوسی گناہ ہے۔

ہونگے ۔ اپنے قلم کو بھی حرکت میں لایئے ۔ مولانا مدظلہٗ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھئے ۔

یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں دردمندانہ خواہش بھی ہے۔ ایک بات ضرور پیشِ نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں ۔ آپ کا بھی اور مولانا کا بھی ۔ فرمایئے اُن سے کیسے التماس ہو ؟

جواب کا منتظر

المتخلص

شورش کاشمیری

۵۵ - ۱۱ - ۹

جواب :- کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آکر مل لیں ۔

ایک ہندو سنیاسی کا خط

۲۴ جولائی ۵۲ء

مخدوم مکرم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ ایک عرصہ سے آرزو خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر موقعہ محل و نیز دیگر مجبوریاں تھیں ۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں امید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی عنایت کرینگے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کیوں جواب دینے لگا ۔ مگر بلند خیالی و پاک دامنی کا سہرہ لوحِ دنیا پر ہر سو پھیلا ہوا ہے اس لئے امید ہے ۔

محترم المقام سلام مسنون

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ۱۹۵۷ کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے۔ اصلاً یہ ایک اعتراف ہوگا۔ ان علمی، ادبی، تفسیری، دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں۔

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایاں اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں۔ اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہلِ قلم اور اہلِ سیاست سے رجوع کیا ہے۔ جو مولانا سے قریب ہے۔ یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں۔

نیاز کار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

بھائی اجمل

سلام مسنون، آج ہی ایک خط حضرت مولانا مدظلہ کو بھی لکھا ہے، کبھی تو ان کی نگہ التفات کو آمادہ کیجئے۔ ع

ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

اس دفعہ سالنامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصہ نقشہ جما ہے، دو سو صفحے کی تصویریں — سہ رنگی و یک رنگی، پریس اپنا ہے، آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش

ابوالکلام آزاد

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

رانی کھیت ضلع الموڑہ
۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہ،

آداب۔ آپ پر بخوبی روشن ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف کریما سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمہ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہل ہند کو مستفیض کرے۔ بشرطِ طلب یہ ہندی کتاب بہ سرو چشم ارسال خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا بالفاظِ دیگر اسیر تھے تو ایک چڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعثِ تکلیف ہوتی تھی۔ آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جد و جہد میں پھر حالاتِ ماضی رونما ہو جائیں یہ تجویز پیشِ خدمت ہے کہ آئندہ آپ کے بستۂ وزارت میں ایک ربر کا گیند بھی اضافہ کر دیا جائے جو بوقتِ ضرورت ایسے مدخلین بیجا کے تدارک و اندفاع میں تیر و تفنگ توکیا بم اور بومرینگ (BOOMRAMING) سے بھی زیادہ مؤثر ہوگی

ابوالکلام آزاد

آج میں نے ہندی کی شعروشاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تصانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص ماننے کو تیار رہے۔ مذکور کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا بعض اشخاص سے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے غرض کتنے ہی الفاظ بے تکے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سیاست سے نکال کر مجھے دو الفاظ میں صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدا کے لئے تواریخ پر چند حروف عنایت فرمائیں گے

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط و نیز دیگر غلطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ شعر نا معلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے تو ہیں خدا کے بتوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش
سوامی۔ برہم دتہ ہنس

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفر یونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلاسوف بنا ہے۔ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ابوالکلام آزاد

مکرم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سابق ایڈیٹر انقلاب لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدردان کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی زلزلوں نے رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استواری بخشی۔ لاہور میں ان سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم ہند کے بعد مہر صاحب کا دلّی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوط پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی باہمی محبت و خلوص کے لئے شاہد عدل ہیں۔

باسمہ سبحانہ

۲۲ مارچ ۱۹۵۴ء

برادر محترم میں نے آپ کو لکھا تھا کہ جلد آرہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی لیکن دفعتہً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤنگا۔ چند ضروری باتیں پیش نظر ہیں، پھر میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے اس سفر میں چار پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۂ معارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیش نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں ضمناً لکھے یا دوسرے اصحاب نے مستقل کتابیں تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ از راہ عنایت میرا یہ عریضہ مولانا کو سنا کر جواب لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند

چونکہ میں مہاجر اور مزدور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستدعی ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں ۔ وہوا ہذا ۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائیے۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیا در کشتیٔ چشم نشیں و سیرِ دریا کن

۲۔ منم آں شمع تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

نیز مغلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ "شالامار" کے صحیح نام اور وجہ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیے۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائع نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام "شعلہ ماہ باغ" تھا۔ براہ کرم اس کی تحقیق و تصدیق فرمائیے۔ اخبار BLITZ نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعا گو و محتاج دعا

نیاز اساس

سری کرشن داس یاس خراب آبادی

جواب:۔ پہلا مصرع عاشقی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں ۔۔۔ لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلی میں بھی تھا اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھی تھیں، لیکن اب وہ تحریر کہیں کاغذوں میں گم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی۔

"۔ رانچی میں مدتِ قیام کو "نظربندی" سے تعبیر کرنا درست ہوگا یا "اسیری" سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "اسیری" میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے یہ سطریں لکھی ہیں لطفاً یہ بھی لکھئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے بہرحال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت سنبھل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ سید صاحب کی سیرت کی جلد اول کے پروف بھی دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پرفوں کا انتظار ہے۔ کتاب انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

نیازمند

مہر

جواب:۔ بہتر یہ ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آجئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہ سبحانہ

۶۔ مئی ۱۹۵۲ء

ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سالِ ولادت سنہ ۱۳۰۵ھ ہے لیکن مہینے، تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲۔ "لسان الصدق" کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر سنہ ۱۹۰۲ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ "الندوہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ سنہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے سنہ ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ مولانا "وکیل" میں کب سے کب تک رہے۔

۵۔ مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر سنہ ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بہ سلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد سنہ ۱۸۵۷ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے، اس لئے کہ بمبئی، بنگال برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے سنہ ۱۸۹۰ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؟ میں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کی قبروں کی

معنی میں اردو میں کے طرز کی بنیاد ڈالی، وثوعم گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس
معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے موجود نہیں ہیں
سان بجا در ظفر حسین خاں کی معرکتہ الآرا کتاب 'انواع فلسفہ' چھپ گئی ہے مولانا
نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتنا وقیع ہے!
انواع فلسفہ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔
آپ نے RESULTANT کے لئے معلومات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا
RESULTANT ریاضی کی مشہور اصلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے۔
EMERGENT کے لئے آپ نے خارجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج
اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا میں نے 'الہلال' کے زمانے میں اس کے لئے ظہور فجئی کا لفظ
استعمال کیا تھا۔ لیکن پھر میں نے اس کے لئے زیادہ موزوں عربی فلتات پایا جو فلتہ کی جمع ہے
ATOM کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن عربی کی پرانی اصلاح
جوہر فرد ہے۔
آپ نے DILECTIE کے لئے کلامیات وجدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات
اس کے لئے درست نہیں ہوگا۔
EXPERIMENTALISM کے لئے آپ نے اختیاریت استعمال کیا ہے۔ جو
بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہئے۔ آپ نے MASS اور
GUANTITY کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔
حالانکہ اس کے لئے صحیح لفظ حجم ہے نہ کہ کمیت۔ 'الہلال' کے مضامین میں میں نے ماس کے

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل عریضہ خاں صاحب کی وساطت سے خدمت گرامی میں بھیج چکا ہوں۔ آج دوپہر کو لیٹا تو معمول کے مطابق سب سے پہلے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے "غبار خاطر" میں کسی قدر بدل کر چھاپا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ غور و فکر کے باوجود معلوم نہ ہوسکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی۔

شعر یوں ہے :۔

من ازیں درد گراں مایہ چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

لیکن غبار خاطر میں "درد گراں مایہ" کی جگہ "رنجِ گراں بار" چھپا ہے

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کس وجہ سے تبصرہ لکھا تھا؟ آیا اس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس تبصرہ کا کوئی ٹکڑا آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہلی دوبارہ آؤں تو پوچھوں۔

والسلام علیکم
نیازمند
مہر

جواب :۔ ہوسکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے دیوانِ عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں۔

شرفِ جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں وقوعہ گوئی

محترم مولانا صاحب

معاصر امروز، لاہور نے آپ کا مضمون "اسوۂ حسین" ماخوذ از داستانِ کربلا بشکریہ نفیس اکیڈمی، اپنے مؤرخہ ۱۳ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانائے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقعہ پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں۔ جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکر گزار رہونگا۔

خادم

دیانند شرما

جواب: جو چیز قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری اور بھائی چارہ "پر عام طور سے اس میں زور دیا گیا ہے اور اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

لئے حجم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے PLATONIC IDEAS کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کیلئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور یہی صحیح ہے اعیان کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے۔ RESPONSE کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردِ عمل دو لفظ لئے ہیں۔ ردِ عمل REACTION ہے RESPONSE کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

SELF کے لئے آپ نے ذات اور نفس دو لفظ لکھے ہیں۔ صرف ذات استعمال کیجئے۔ نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر SELF کے لئے نفس استعمال کریں گے تو NOUS کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں NOETIC کے لئے نفسِ ناطقہ استعمال کیا گیا ہے

VELOCITY کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ لیا ہے۔ پھر آپ MOVEMENT کیا لکھیں گے!

PROTON کے لئے آپ نے برق مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل المخارج ہوں بجنسہٖ اختیار کرلینا چاہئیں اردو میں ELECTRON اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں۔

PLURALISM کے لئے آپ نے کثرتیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہب کثرت کر دیجئے۔

شری دیانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

منتظرِ کرم

محمد نظام الدین

جواب:۔ کتاب الہند کی طباعت و اشاعت یقیناً ایک علمی و ثقافتی کارنامہ ہے۔
دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدر آباد کے پولیس
ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرون ہند سے اس ادارہ کی سلامتی کے
متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے ــــ

ڈاکٹر نور حسین صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ ۔ ۳ ستمبر ۱۹۵۴ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا! السلام علیکم و رحمۃ اللہ
ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ چند ایک مسائل
ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے الجھن بنے ہوئے ہیں۔ آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے
حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے
کرنے کی اہلیت سرزمینِ پاکستان و ہند میں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا۔ لہذا آپ
ہی کو تکلیف دے رہا ہوں میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا
جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے۔ مسئلۂ توحید اور اس کے
بعد محض عمل صالح پر زور۔ یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابلِ قبول۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ نتائج
کے اعتبار سے (قرونِ اولے کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ

مساواتِ انسانی کا یہ تصوّر فطری ہے۔ اور خدا کی بخشش ہے۔ رہ گئی اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرت صحیح اُسے راستہ دکھا چکی ہے اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد
۲۳۔اگست ۱۹۵۶ء

معظمی و مکرمی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔اگست کا بے حد مشکور ہوں۔ حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمایئے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابدالاباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالےٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخِ ثقافت عالم میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی سچی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا۔ وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالمِ تحقیقات کو مکرر دستیاب ہو جائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے پروف مکرر ملفوف ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۴۔جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمایئے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

ساتھ تو ایسا نہیں ہُوا۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا۔ لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ ھُوَ الَّذِی اَرْسَلَ رَسُولَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب آنا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔

اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حالی مرحوم جس قدر برائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں۔ آج کے مقابلہ میں شاید وہ دور بہتر تھا۔ شرافت، دیانت، تحمل، وسعت قلبی ایثار، رحم، سچائی، عدل و انصاف، ان سب خصائل سے ہمیں دور کا بھی تعلق نہیں۔ نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلائیے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاح حال کی امید ہے۔

جو میرے ظنون و شبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالم اسلام میں یہ حالت کیوں ہے۔ مشرق وسطی کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہوگئی اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن نہیں لیکن آخر امید کی کرن کب روشن ہوگی۔ ان امور کا جواب دیجیے، اور ضرور وقت نکالیے میں پرانا نیاز مند ہوں اور تسکین قلب کی تلاش میں ہوں۔

نہیں ۔ کم ازکم بارھویں صدی عیسوی یا خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دارومدار ایسا مسدود ہُوا کہ پھر نہ کھلا ۔ اور آج تک پیروانِ اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں ۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروانِ اسلام دو مختلف چیزیں ہیں ۔ اور دونوں کو غلط نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں ۔ تہذیب و تمدن ، اقتصادی مرفع الحالی ، خدمت علم و سائنس وراثت فی الارض ، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص انفرادی اور اجتماعی ، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور پھر بظاہر کوئی صورت اصلاح حال کی دکھائی نہیں دیتی ۔ مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں ۔ اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں ۔ خدمت خلق ، راستبازی ، بلند اخلاق ان چیزوں کا عیسائی اقوام کے اندر اس قدر دور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے ۔ علم و فن کے ہر گوشے میں وہ ہم سے پیش پیش ہیں ۔

اس سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ جن جن تہذیبوں نے اس دنیا میں آج تک سر اٹھایا ۔ مثلاً بابل و کلدانیوں کی تہذیب ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب ، مصریوں کا عروج و ترقی ، یونانی اور رومن تہذیبیں ۔ یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ ابھریں ۔ تو کیا فطرت کا یہ ازلی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے ۔ اور پھر وہ نہیں ابھرتی ۔ جیسے کہیں اسلام کے

اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت شاہد ہے "فانکحوھن باذن اھلھن" اور دوسری آیت "وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم" سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں "الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم" سے صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ یہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانھم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقدِ مناکحت کے بعد ملکِ یمین بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملکِ یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد حرّہ۔ بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری و عزیزی و قاضیخان وغیرہ سے اسکا ثبوت ملتا ہے کہ ملکِ یمین سے بدوں نکاح وطی جائز ہے اور اس دورِ حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابنِ سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن وحدیث اور دلائل عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی سے بغیر نکاح وطی جائز ہے۔

اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن وحدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

راقم نیازمند

محمد لعظیم

جواب:۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت

آپ کا ادنٰے نیازمند

نور حسین

جواب :- اسلام دین فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے ۔ باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی پھیلی ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی لوگوں کی بدعملی پر ہے ۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اب لوگوں کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفتاء

رانچی پیرتج روڈ

۴ اگست

ذوالمجد والکرم حضرت مولانا محترم ! ادام اللہ بقائک السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ ـــــ ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں ۔

آپ نے اپنے ترجمان القرآن میں " ما ملکت ایمانکم " کے لئے نکاح ضروری قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی ناجائز ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورہ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ قرآن کے نزدیک اتحاد تناسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے ۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو ۔ حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے ۔ ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جب کہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے ملک میں ہو تو مالک سے

ابوالکلام آزاد

آپ کا خیر اندیش

کریم الٰہی بدر

جواب :۔ فارسی شعرا کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف سال موجود ہے۔ ہندوستان کے تذکروں میں مراۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستان مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب ہیدالش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی شائع ہوا۔

عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنا لئے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدا میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے شدائد کو کم کیا اور پھر سورۂ محمد کی آیت واِمّا منّاً اِمّا فداءً نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آچکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورہ مومنون میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سرمد شہید کے متعلق استفسار

۷۸۶

لاہور

گرامی قدر جناب!

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاسِ عالم پر ابھریں گے جو اوراقِ پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، صفات اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خونِ شہادت کے قطرے" نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہ کرم مجھے وہ کتب اور رسائل تجویز فرما دیجئے جن کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوبہ تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی۔ جب عبدالصمد میرے مکان میں آکر مقیم ہوا۔ اور فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دل و دماغ میں پیوست کر دیئے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہوگا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا جن پر سراج الدین خاں آرزو۔ شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگان مدرس عمر بھر درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے۔ تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا۔ حتیٰ کے میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا دیا۔

اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ہے لیکن محض رفع غرابت کے لئے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اس عمر میں شعر و شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو پنچ بہادر نکالا کرتے تھے۔ ایک گلدستہ ارمغان فرخ کے نام نکالا۔ اور کلکتہ میں بعض شعراء اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی ؎

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر ان خرافات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے ہیں۔

ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب

میر تقی میر سے غالب کی ملاقات کی وضاحت

ایک صحافی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا کہ غالب کے متعلق بعض تذکروں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ان کا ابتدائی کلام میر تقی میر کے پاس کسی نے پیش کیا تھا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اسے اگر کوئی کامل رہبر مل گیا تو صاحب کمال بن جائے گا۔ نہ ملا تو مہمل بکنے لگا میں اس واقعہ کو اب تک افسانہ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں روشنی ڈالئے۔

اس صحافی کے سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے جو طویل مکتوب لکھا تھا۔ اسے من وعن درج کیا جا رہا ہے۔

کلکتہ ۳ $\frac{12}{34}$

عزیزی خط پہنچا

میر تقی میر والی حکایت کی مندرجہ بالا یادگار غالباً عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں غالب نے خود

کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے میں نے ایک شعر اور کہدیا۔

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔"

اس وقت سوچتا ہوں یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔

اس کے بعد یہ خبط اور بڑھا۔ اور خیال ہوا کہ ایک گلدستہ نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا میری عمر اس وقت تیرہ برس سے کسی طرح بھی زیادہ نہ تھی پھر اس زمانہ میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی مخزن نیا نیا نکلا تھا میں نے چند تحریریں بھیجیں۔

لکھنؤ سے نوبت رائے نظر۔ خدنگ نظر نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کردیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لی۔

اسی زمانہ میں مولوی احمد حسین مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی تھی پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں ایک رسالہ خود نکالنا چاہیئے۔

چنانچہ "لسان الصدق" جاری کیا یہ تمام معاملات ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے ہیں اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہوگیا تھا۔ اور چونکہ قدیم طریق یہ تھا

نشتر یہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں ہیں۔ لیکن اس وقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی جب کہ ۴۷ برس گذر چکے ہیں۔ اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ جب ارمغان فرخ "میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالہ میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں متوزخ۔ رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہدو۔

میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو۔
میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دیئے۔

مراجعہ سے تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔

دیکھئے بے خبری میں کتنے صفحے لکھ گیا یا تو خطوں کے جواب میں دو سطر لکھنا بھی دو بھر ہوتا ہے یا یہ عالم ہے کہ دس بارہ صفحے سیاہ ہو چکے ہیں اور ابھی تک کہانی ختم نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے رمضان کی آمد نے ایک بجھی ہوئی طبیعت میں تازگی پیدا کر دی ہے۔ عشاء کے بعد بیٹھتا ہوں تو صبح تک دماغ کے کیف و سکون میں کوئی خلل اندازی نہیں ہوتی۔ اس وقت تین بج چکے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی سبز چاء کا فنجان سامنے دھرا ہے جو ایک جاپانی دوست نے حال ہی میں بھیجا ہے۔

آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور دل میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ایسی چائے کے فنجان میسر ہوں تو پھر اور کون سی نعمت باقی رہ جاتی ہے جس کی انسان خواہش کرے میرے لئے یہ چائے سحری کی صبوحی بھی ہے اور اذکار کا جام خمار شکن بھی۔

آپ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچہ ہائے غدر کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں نے اخباروں میں ان کا نام دیکھا تھا مگر کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ ان میں کوئی قابلِ اعتنا بات ہوگی۔ کیا واقعی غدر کے زمانے کی تحریریں اس میں استناد کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہو تو لکھیئے۔ کون کون سے رسالے ہیں بہادر شاہ کے مقدمے کی روئداد پرانی بھی چھپی ہوئی موجود ہے اور پنجاب میں ایک نئی بھی چھپ گئی ہے۔ مرزا حیرت نے چراغ دلی میں اس کا خلاصہ اردو میں بھی چھاپ دیا ہے۔ اودھ کی بعض تحریروں اور روزناچوں کا انگریزی ترجمہ سلیکٹ پیپرز کے سلکشن میں شائع ہو چکا ہے۔ معین الدین کا نامام روزنامچہ اور منشی مرزا کی تحریریں چھپ چکی ہیں کیا خواجہ نظامی کے

کر فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں اس لئے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا

اس میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے ان کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔ اس زمانے میں تقریر کیطرف طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے سنہ ۱۹۰۳ میں کی۔ اس وقت عمر پندرہ سال تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں اگر میں اس عمر میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لئے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسام الدین حیدر

مرزا سلیمان شکوہ خاندان سے

تعلق رکھتے تھے اگر یہ خیال صحیح ہو تو ان کا آگرہ سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی جب قمر چہرہ کے معاملہ میں نور الدین حیدر سے ان بن ہو گئی تو وہ لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ کچھ دنوں جنرل گارڈن کے یہاں رہے پھر آگرہ کا رخ کیا۔

ہو سکتا ہے کہ حسام الدین حیدر اور غالب کے ابتدائی تعلقات اس زمانہ میں شروع ہو گئے ہوں یہ محض قیاس ہے وثوق سے نہیں کہہ سکتا بعض کتابوں کے

ابوالکلام آزاد

تذکرہ

پروفیسر محمد مجیب

" ان اوراق پریشان کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا" مولانا آزاد
نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے " اب وہ مصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کردوں. اس تمام
داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصل مقصد یہی تھا" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر
ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے - اس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ
ہے . وہ ایک انشائیہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعلہ اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ
کی قوت نطق، ایک بڑے دل کا گریۂ بکا، ایک المیہ کا محزون نغمہ اور ایک فتح کا مسرت
انگیز زمزمہ) وہ ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصور کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا
تصور جو فطرت انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے -
لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔
ان کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابل توجہ ہے - وہ مرحبا! ایسے مشاہیر پرست معلوم

ابوالکلام آزاد

رسالوں میں ان کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے۔

والسّلام

ابوالکلام

جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہوگئے مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کرکے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کے تمام تفصیلات آجاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالترتیب جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزین پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی مبہم بنالیا اور ان کی مادی زندگی ایسی ہوگئی کہ موضوع کلام سے خارج ہوگئی۔ مرزا فضل الدین کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی سوانحِ عمری لکھی ہے ایسی نہ لکھی جائے تو کس قدر غلط فہمی کا باعث ہوسکتی ہے

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کرسکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا مقابلہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کردیا۔ کوئی کتاب بہ مشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہوسکتی ہے جتنا کہ تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعطیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظر ثانی نہ کرسکے، حوالوں کی جانچ نہ کرسکے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ چکی تو مولانا کو اطلاع

ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۲ء میں واقفیت ہوئی۔ اس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقاء کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے 'الہلال' شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسخر کر لیا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پُر اثر شخصیت کے مداحوں کو اُن کے حالات سے واقفیت ہونی چاہئے۔ لیکن مولانا آزاد نے ان کو خودنوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق بنا کر ٹال دیا۔

"کتنی بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ اُن کو نظر انداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن یہ بات قابلِ شکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاح کے معاملے میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ" ملتا رہے گا۔ جو کچھ ان کو ہر ہفتہ ملتا رہا اس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خودنوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے ہٹنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ ان کو روکیں اور فرمائش کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا: "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں۔

روحانی قوت ہے اور اس تجلّی کا نتیجہ ہے جو اس دنیا کی روشنی سے نہیں ہے: تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اس ہی کیفیت مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہئے۔

یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش معہود تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا۔ اور تہمت حیات منتہم، الناس نیام، اذا ماتو فانتبہوا۔

شورے شد وازخواب عدم چشم کشودیم   دیدم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔ جواں بخت و جواں طالع، جواں باسبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا تھا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سروسامان کا زناپید، وقت جا چکا اور ہر آن ولمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے۔ پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے

کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا: "لوگوں نے اپنی دلجمعی اور فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیِ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے:" یہ عزم خود آمدی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پرجوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے۔ وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لئے تبحرِ علم و فضل اور الفاظ پر پرزور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرزِ بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اس وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وضاحت ہے۔ ان کو اس کا بھی یقین ہے کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتدا میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ یہ آخر میں تتمہ میں وہ اپنی "سوانح عمری" لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہٗ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ ان کا زورِ بیان روانی ان کی اشاریت، ان کی اردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ

مستقر و موطن در پیش البتہ کسی کے لئے مساءت مستقراً و مقاما میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے حسنت و مستقراً و مقاما ۔ ۔ ۔ ۔

" مولد و منشاء طفولیت " وادی غیر ذی زرع عند بیت المحرم ہے یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفہا و کرامہ ، محلہ قدوہ متصل باب السلام ۔ ۔ ۔ ۔

" اس وقت کہ ۱۳۳۵ ہجری قریب الاختتام ہے ، قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہنچ چکا ہے ۔ ؎

یقولون ہل بعد الثلاثین ملعباً   فقلت وہل قبل الثلاثین ملعباً!

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں ۔

کس نمی گوید مرا از منزل آخر خبرے   صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

جتنی زندگی گزر چکی ہے ۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں ۔ اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا قلم درماندہ تذکرہ ونگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار و تعبیر ۔ اپنی سرگذشت اور روئیداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں ؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ قلمبند ہو تو کیونکر ہو ۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں ۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے ۔ طوفان نے درخت گرا دیئے ۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں ۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی ۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کئے ، خرمن و برق کا معاملہ ، آتش و خس کا افسانہ ، ان سب کی سرگذشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے ۔ میری سوانحعمری بھی ان ہی میں مل جائے گی نصف افسانہ امید اور نصف ماتم یاس ۔

جو لٹ چکی، اور قافلۂ امید بھی کب پس ماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو سحابؔ چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ۔ اصل فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو کل آنے والے دن آزمائش میں پورا اترے لکل امرئ منهم یومئذ شان یغنیہ۔ اگر وہاں رَوح و ریحان وجنت النعیم اور فوز عظیم کی فیروزی وکامرانی ہاتھ آئی تو پھر بخت بخت ارجمند ہے۔ لیکن اگر وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترہقہا قترۃ اور لابشریٰ یومئذ للمجرمین کی رسوائی اور محرومی ملی تو پھر نہ اس حرمان نصیبی کے لئے امید ہے۔ نہ اس ماتم حسرت کے لئے خاتمہ، بخت اسکندری اور تخت جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لے کر کیا کیجئے ؎

گر بدانم کہ وصال تو بدیں دست دہد — دل و دیں را ہمہ در بازم و توفیر کنم

ان خیالات میں منہمک ہونے کے بعد مولانا آزاد واقعات اور تاریخوں کی طرف منعطف ہوتے ہیں۔

"آبائی وطن دہلی مرحوم ہے، اسلام علی نجد و من حل بالخذ مگر مادری سرزمین مطہر طیبہ وو دار الہجرت سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذاران عشق و کعبہ نیاز مندان شوق، علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ ؎

دارم دلے گرداں کہ من قبلہ نما خوانمش — رو سوئے ابروئش کند، ہر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہئے کہ بحکم "کن فی الدنیا کانک غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپارہ، سب کو ایک ہی

یہی مضمون زیادہ ایجاز بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے ؎

متی یا عذنا الوصال، دو ہر نا   یومان یوم نوی و یوم صدود

عہد طفلی ایک خواب عیش تھا۔ حیف صد حیف کہ ما زود خبر دار شدیم۔ آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی۔ اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح فریب کے لئے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ امیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستان امید اور نگار خانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدۂ دل کی کام جوئیوں کے لئے بنا ہے۔ اور گویا گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبد غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی۔ یا تو گرفتاران طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی تھی۔

شہر لیست پر ز خوبان و ز ہر طرف نگارے   یاران صلائے عام است گو می کنید کارے

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا۔ سرمستی و سرگردانی نے جام بھرے جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس نے جو راہ دکھائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ بے توجہی ہے اور وقت بے نوائی کا، سا قیا مرنج از من عالم جوانی ہاست ..... جس راہ میں قدم اٹھایا زنجیر دل اور کمند دل نے استقبال کیا جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو ذکر کیجئے۔ ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنئے۔ دل

عاشق نہ شدی، محنت الفت نہ کشیدی
کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

پہلے مجسم امید تھا۔ اب سر تا سر حسرت سا ہوں۔

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام، اس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستان سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگذشت سن لیجئے۔ حکایت و برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے صرف ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے ؎

ہمسایہ شنید نالہ ام، گفت
خاقانی را دگر شب آمد

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی ہیچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت؛ ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا ؎

بجھا ہے دل جب سے مجھ حزین کا
چراغ جلتا نہیں کہیں کا

یا امید و حسرت کے دو دن، ایک ہوس تعمیر میں بسر ہوا۔ ایک ماتم تخریب میں ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر جی بھر کے آنسو بہائے ؎

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش ست

اب ابو طالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی۔

بدنامی حیات دو روزے نبود بیش
آنہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت
یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں
روزے دگر بکندن دل زیں و آں گذشت

اور در اصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاہا۔ اور قالو لبثنا یوما او بعض یوم کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے

رہیں ۔ بادل گرجتے رہے ۔ لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی ۔ اور پشت غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی ۔

نہ پہنچی صدف سے لب تک دعا ہی ، . . . .

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے . . . . .

"البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت وخود فراموشی میں نفس لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ ان کے شور و غل میں یہ سرگوشی ملامت کب کام دے سکتی ہے . . . . .

لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ سے

کار سازِ مابفکر کارِ ما ۔ فکر ما در کارِ ما آزادِ ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا عجب حال ہے ۔ کہ علم بے خبر افتاد وعقل بے بس شد ۔ ہر چند راہ ایک ہی ہے ۔ لیکن کرشمے بے شمار ہیں اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوے سے نہیں ۔

اے ترا با ہر دلے رازے دگر ۔ ہر گدا را بردرت نازے دگر ۔

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا ۔ کوئی بھاگتا ہے اور کمند پھینکے جاتے ہیں قانون طلب وسعی سے انکار نہیں ۔ لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے . . . . . .

ناگہاں جاذبہ توفیق الٰہی پردۂ عشق مجازیں میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی

ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا، ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی ہر فسوں ساز نے اپنا فسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش رُبا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا۔

واۓ بر صیدے کہ یک باشد و صیّادے چند

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لحنت کو رہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے   کار از دوا گذشتہ و افسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی اور سرفرازی کے لئے دل خون ہوا کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی تو اپنے پندار اور خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعلقی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسو اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہیں کی اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کے وجد کیا۔ تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آگئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب ہی کمی تھی۔ اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ تجلیاں کو تدن

کو چھوڑنا اور ایک سے بڑھنے کے لیے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے
کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول لئے تھے۔

درقبولِ نظرِ عشق ہزاراں شرط ست　　　　اوّل از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

"تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوائی اللہ کی ساری زنجیریں
ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی
ہو کر گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔
یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو
ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری
کا انتظار ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے
دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظرِ
شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

گفتم بچہ گونہ می کشی و زندہ میکنی　　　　از یک نگاہ کشت، بجو لب دگر نہ داد

• ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے؟ کوئی مدمیانی منزل ہو اگر قدم آگے بڑھنے سے
رک گئے تو وہ ہی منزل بُت ہے اور رہرو اس کا پرستار، تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی
کی منزل کیوں نہ ہو . . . . . .

چنانچہ الحمد اللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال
پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم وراہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی
گوشہ کوئی مقام نہ چھوڑا . . . . . .

آوارگیوں نے خود بخود شاہراہ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں سیلاب آتا ہے۔ تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا ......

اصل میں تین ہی منزلیں ہیں ۔ ہوس، عشق، حقیقت

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست ۔ خام بدم، پختہ شدم، سوختم، اور یہاں عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائنات ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جسقدر باطل ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہے۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمال حقیقت ایک نہ دیک رنگ پر ڈال رکھے ہیں ورنہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آن ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی۔ لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرا دیئے، مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں ہوشیاریاں اس پر سے نچھاور، گر طمع خواہد زمن سلطان دین، خاک بر فرق قناعت بعد ازیں اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا دارو مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب

ہو جائے۔ سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے سارے پردے عملی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں سوکھائیتں بھری تھیں.....

"حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے۔ جن تک تدریج رسائی میسّر آئی، قطع نظر اس معاملہ خاص کے عقائد، اعمال عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں بس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے۔ جتنی رہنمایاں ملیں صرف اسی مرشد فیض و ہادی طریق سے ملیں...

"علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے تبلائی، معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقایق کا وہی معلم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے تبلائے۔ سنتہ کے اسرار اسی نے کھولے، نظر اسی نے دی۔ دل اس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ہوئی۔ کون سا الجھاؤ تھا جو اس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اس کے دارالشفاء سے نہ مل سکی؟.......

"ہاں - یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اس رندی اور ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو

اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش...

اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برا ہونا مشکل ہے۔

عریاں تنی خوش مدت، وے زیب بگرست — دامان چاک چاک و گریبان دریدہ را

اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ زاری کی ہو تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک لمحہ ایسا گذر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر چکی ہیں۔ ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر سمی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ ہی میں طوفان اٹھاتے رہے.....

"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا۔ لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی کامیابی میں پوشیدہ تھی.....

"وہی دنیا جس کے میکدہ منخود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اللہ اللہ کر اشارے کئے، خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار ہا اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھالنا پڑا تاکہ فضاء آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ

میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور یہ خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انہوں نے قبول کیا، کبھی رد کر دیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز اور مباہات کی بات ہے اس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (و۔ ۱۵۸۱) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اس کے بعد وہ اس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے۔ وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبہ خلافت و امامت کا ادعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اس وقت شدید مذہبی فساد برپا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت، جو لامذہبیت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ تہذیب، جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے۔ سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے۔

لیکن اس صورت حالات میں بھی جو لوگ الیقین کا آلہ کار بنے اور مذہبی وجوہ سے ان علماء کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے حالات کو قائم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص واقعہ کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں

عین اکیس برس کی عمر میں (کہ جنون شباب کی سر مستیوں کا اصلی نور رہتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بد نصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے جب کہیں جا کر اس کو سہی پی دم لے سکے، جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں ...

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارنمایاں ہے کہ پابندیٔ مذہب اور تصوف میں مطابقت کر دی۔ اور مذہبی غلو یعنی شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطور ریا داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوش ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کر دی۔ خدا کی نگاہ میں، منفعل گنہ گار کو، اس محتاط متبع شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندیٔ مذہب کی، ان لوگوں کی پابندیٔ مذہب کی جنہوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طریقۂ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے، ان کا خاص تعلق حق سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندیٔ مذہب، رحمت سے راسخ العقیدہ ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے "میرے خاندان

نے کلمۂ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور تباہ کُن حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اس طبقہ کے تھے جس نے شریعتِ اسلامی میں وغیر واقعی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد ان سہی حالات کا اعادہ اور تکرار اکبر کے زمانے میں دیکھتے ہیں جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک، امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں۔ اور اس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ اس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہے بلکہ ان شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے۔ شیخ سلامی (و ۱۵۴۷) شیخ داؤد (و ۱۵۷۴) شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی۔

ایقان کے لئے ولولہ کی، تمام زندگی عمل صالح کے لئے وقف کرنے کی بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے۔ اور یہ مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیر پختہ منزل ہے۔ جس میں ان کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالم گیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں یہ گفتگو ہوسکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا اس میں تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو ان پر واضح

اس میں حملہ کے بانی ، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حامی حق سید محمدؒ جون پوری تھے ۔ سید محمدؒ کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے ۔ یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہونگے مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمدؒ کی تعلیمات کی مخالفت اور ان کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا ۔ ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعویٰ کی تھی ۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصد مخالفت سید محمدؒ کے تجدیدی رجحان ، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ و والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا ۔

سید محمدؒ کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں ۔ اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجد ان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں ۔ اور جس آزادیٔ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ ان کو ملنی چاہیے ۔ یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہوجاتی ہے ۔ اللہ والے لوگ اس فضل سے پہچانے جاتے ہیں جو ان پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔ اس زمانہ کے مومنین پر واجب ہے کہ ان کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں ۔ بلکہ ان کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اس کو اخذ کریں ۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندیٔ مذہب پر فخر و مباہات اور اعمال سے غفلت قابل نفرت ہے ۔ وہ اپنی تمام انشاء پردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزرگی اور علو مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں ۔ جیسے شیخ علائی (و۔۔ ۱۵۵۰) ، شیخ نیازی ، شیخ جمال الدین جنہوں

زلیخا

حمیدہ سلطان

"نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، اچٹی بھوئیں، پکے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ دراز دلآویز جسم سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں" "یوسف ہندی" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی تھی۔ ان کے ہمراہ مولانا آزاد کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے علم و فضل اور ادیبانہ خطبوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چونکہ والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں، اسی لئے ان کی میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی

کیا کہ تصوّرِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ تر میدان کا شامل ہونا، روحانی ضرورت ہے ۔ اور اس تخیل نے ان کا تصوّرِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو ۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رُخ کیطرف اشارہ کرتے ہیں ۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے ۔ تذکرہ سے اس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے ۔ جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت موثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو شامل کریں جو ان کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں ان کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے ۔ جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا ، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ ، تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغِ عقیدہ کو اپنے خطیبانہ طرزِ بیان میں پیش کر کے ، عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے ۔

ترجمہ :- محمد شفیع الرحمان)

بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے غسل کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کیطرف اشارہ کرکے یہ بولیں مگر" بھاوج معلوم ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلفِ پریشان بہت پسند ہے جو آپ سر نہیں گوندھتیں"

وہ حجاب از سے لجاکر بولیں" اے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی خفقانی ہوگئی ہے کہ چوٹی گوندھنے سے دل گھبراتا ہے"

وہ اندازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیسی باحیا بیوی تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں۔ یہ اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کیطرف اشارہ کرکے کہا " اے نوج! ایسی بھی کیا سادگی، وہم نہیں آتا۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا" آخر ہیں نا آپ بھی نند، بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آئندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی" دوسرے ہفتہ جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی جس کا خوبصورت بل لگا یلا اُوڑھے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے۔ اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دلربا کردیا تھا۔ یہ ان کو گلے لگاکر مسرور لہجے میں بولیں" اے ہے کہیں بُری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاءاللہ چشم بددور بہت اچھی لگ رہی ہو" وہ حسبِ عادت لجاکر

کی بنیاد پڑی - پھر یہ مراسم دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہو گئے یہ دونو اپنے مکرم بھائی سے ملنے بھوپال سے آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چہیتی بھاوج بیگم زلیخا آزاد سے والدہ صاحبہ کو ملوایا - مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے - والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ والی بیوی تھیں - مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے ان کو کھینچا اُدھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل گئیں کہ باقاعدہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں اور دوسرے ہفتہ وہ یہاں آتیں - ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف، مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی - سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں - چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے نند بھاوج کے رشتے کو لے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلاف عادت اس دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے گا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا - میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی ۔ وہ بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں ۔ دو چمچے ابلے ہوئے چاول ، تھوڑی دال ، سبزی یا گوشت اور دہی - چونکہ صبح بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں - اس لئے دوپہر کے کھانے کے

نے لو۔" اور میں بہت ہی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب
خطابت، مذہب و سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمتہ کی عظمت کا نقش
میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ
ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر
والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے دہا دج! آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں"
وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرآن پاک
کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا
جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے۔ باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے
کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی کے
غم میں مولانا پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانح حیات جب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی
کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ
جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیا
تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے
اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد

بولیں "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے ہوئے شرم آتی ہے۔"
"اسے ہے تو تم نے حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمہاری عمر کون سی ایسی ہے سہاگنیں تو بڑھاپے میں بھی رنگا پیلا پہنتی ہیں" انہوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر زنانے میں ہی تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیویاں باتوں میں لگیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان سفید کرتے پیجامے میں ننگے سر کتابوں کے ارد گرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اس کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں "کیوں کتابیں نہیں ہیں؟"
میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لئے واپس آگئی۔"
"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ذرا ان کو فرصت ہے۔ اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمہارے تو ماموں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو ملوا دوں۔" انہوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انہوں نے میرا تعارف کرایا مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا "آؤ بھئی جو کتاب چاہو

ہستی سنونتی اپنی دھن میں مگن رہی۔ اپنی خرابی صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بنی ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا ماندہ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں۔ اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے۔ گھر یلو آرام وہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکر صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگِ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے فن کار غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا۔ یا ان کی ازدواجی زندگی اچھی نہیں گزری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انہوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورتِ حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر

گئے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جاکر ملتا ہے۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انہوں نے پیر کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ انہوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں موہنی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انہوں نے اپنی بہو بنالیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا قبضہ ہوگیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو انہوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کو ان کا حساس دل نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انہیں پسماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعلۂ نفسی اور آتش بیانی قلم و زبان سے دلوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی رفیق حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جدائی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یادِ الٰہی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گر گئی تھی۔ مگر یہ

لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار شمع صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن ان کا دل ہل گیا۔ وجود معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جانگزا غم کے زیر اثر انھوں نے غبار خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاخ بریدہ سے تشبیہہ دی ہے جس کو موسم بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں:-

شاخِ بریدہ را نظرے ہر بہار نیست

اُن کا دلی تمدن اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی زلیخا کی آخری آرام گاہ پر گئے تو باوجود اس بے انتہا ضبط و تحمل کے جو ان کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ دشوار رفتن کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ بذلہ سنجیاں جو ان کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ زلیخا بیگم کی زندگی میں ان کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ ان باوفا بیوی سے خود ان کو بھی دلی لگاؤ ہے۔ لیکن مرنے والی کے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اسی خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے

کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ اُن کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کئے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں "بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو"۔ ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۱۹۔ اپریل ۴۳ء کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جسدِ بے جان تو سپردِ خاک کر دیا گیا اور روح شاید قیدِ جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہوگی۔

مولانا صاحب "غبارِ خاطر" میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

> "گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا کہ یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس

ابو الکلام آزاد

نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح

غلام احمد فرقت کاکوروی

ابتدائے آفرینش سے اب تک شاید ہی کوئی ہستی ایسی گذری ہو جس کی زندگی میں وہ لطیف اور پر مسرت لمحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا ہنسنے ہنسانے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چہلیں کر کے اپنے لئے لطف و مسرت کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں ثقہ اور غیر ثقہ، مہذب اور غیر مہذب، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کی تخصیص نہیں ہوتی ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ جو بظاہر بے حد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دیئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا بعد ہوتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا شمار بھی انہیں بزرگوں میں سے تھا۔ جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی

علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی ۔ اللہ تعالےٰ نے جیسے اور بہت سی نوازشوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی ۔ میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے ۔ میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا ۔ وہ اس دنیائے آب وگِل کی رہنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں ۔ ان کی پاکیزگیٔ خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اٹھاتی تھیں کہ رہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا ۔

۱۹۴۲ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی ۔ جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے ۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا ۔ مولانا صاحب ایک دم اس طرح خاموش ہوگئے گویا اس ذکر نے ان کے نشتر لگا دیا ۔ وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے ۔ میں بھی دم بخود پشیمان سی بیٹھی اُنکے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی ۔ آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہوگیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی زلیخا کی تلاش میں عالمِ جاوداں کو سدھار گئی ۔

ابوالکلام آزاد

جداگانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اسی طرح اُن کا طرزِ تحریر بھی تمام ادیبوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز، اُن کی زبان ان کے لہجے، ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے لکھتے آخر میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترنم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پوری نثر اس طرح جگمگا اٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک برجستگی اور بے ساختہ پن ہے "غبارِ خاطر" میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور چینی چائے پر لوگوں کو ردوقدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں :-

"دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں انہوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کردی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔"

نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے۔ بلکہ ضلع جگت اور رعایت لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی،

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کا باہر کر دو ورنہ پھر اسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

اُردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نو عمر اور نوخیز زبان کی حیثیت رکھی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس تھوڑے سے سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ چٹکی ہے کہ پڑھنے والا اس کی عمر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور ظرافت دونوں میدانوں میں ایک جیسے رستم اور مرد مجاہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے ممتاز طنز نگاروں میں کھڑے کر دیئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں اُن پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشا پردازوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار اور انشا پرداز کے یہاں نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک

خیالِ قد بلند تو می کند دل من
تو دستِ کوتہ من بین و آستین دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھئے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے ؎

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا۔ ؎

بیک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سرانداختم "

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص اندازِ بیان ہے اسی طرح ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے اندازِ تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت، ان کی تقریر کا انداز اور اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ طلسم کامیاب ثابت ہو سکے مجھے بوجھے اس پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجتماع کر لیا اب آپ سر پیٹئے سنتا کون ہے ؎

آمی کی سی کہنے لگے اہلِ محشر
کہیں پُرسشِ داد خواہاں نہیں

مولانا کی بلند ترین مزاح نگاری اور بذلہ سنجی کی مثال ان کے ۱۷ اور ۱۸ - مارچ ۱۹۴۳ء کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے ہیں - ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں :-

"چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں -

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے - میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا ؎

کورکھاکہاں جائے ۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت لفظی سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"اسے کلکٹر کے یارانِ طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بے وقوفی کہ اسے بہلا پھسلا کر یہاں کے مقامی قیدخانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قیدخانے کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قیدخانے میں جو اسے رات دن قید و بند کے توے پر سینکا گیا تو بھوننے تلنے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق کو کیا معلوم تھا کہ ساٹھ روپے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے ۔ اس ابتدائے عشق ہی نے کچومر نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ بھی تیار ہو گیا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی اور صداقت کی بجلیاں کوندتی ہیں ۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں بلکہ دوامی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ عموماً طنز کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ مگر مولانا کا طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں ۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پورے طور پر اس جذبے کی اپنے دل میں پرورش کر لیتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے کانٹ چھانٹ کرتے ہیں ۔ ان کی انشا پردازی الفاظ کا گھروندا نہیں ہوتی ؛ وہ ایک سیلاب، ایک طوفانِ بلاخیز

سب سے جداگانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اردو مزاح میں ایک چیز رعایت لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مشاق مزاح نگار بڑا ہی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس کرتا ہے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چٹخارے بھی لیتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ چیتہ خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا تھا) اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ چنانچہ ایک باورچی کا شہر کے کلکٹر نے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اس قلعے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> "دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا اطباخ (باورچی) موعود یہی ہے ؎
>
> آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید
>
> مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آگیا تھا لیکن کچھ ایسا کھویا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔"

ایک مصیبت اس بدنصیب باورچی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اسے قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس باورچی

تو مولانا لکھتے ہیں :۔

"شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا ہے۔ میں نے کوؤں کو دریوزہ گرانِ ہرجائی اس لئے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ ہر دروازے پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چل دیئے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمود کو رفتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے میناؤں کے دوسرے پرندے اور جانور ان کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :۔

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا تناور درخت ہے اس پہ گلہریوں کے جھنڈ کودتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دسترخوانِ کرم پر ٹوٹ پڑیں

یاران صلائے عام است گر می کنید کارے

پھر فوراً گردنیں اٹھالیتیں۔ ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر کچھ اشارے بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو داد ضیافت دیتے ہوئے بطریقِ حسنِ طلب یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ

کا دھارا اور ایک شمشیرِ آبدار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کی نفیس صیقل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلوان سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ابوالکلام کی مثال اُس پہلوان کی ہے، جو وسطِ میدانِ جنگ میں مبارز طلب ہو اور دوسروں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو"

جیل میں ڈاکٹر محمود کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ طشتری میں دانہ لئے پرندوں کو کام کرکے بلاتے مگر ان آہوانِ ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمود اپنی اس ناکامی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ مولانا ان سے کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمود کہنے لگے۔

"سید محمود کہنے لگے۔ عجب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانے کی پیشکش بھی ایک جرم ہوئی۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کے تغافل کیشوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیازِ عشق کے دعوؤں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں"۔ ......

جب ڈاکٹر سید محمود میناؤں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف ملتفت نہیں کر سکے

اب تک مولانا کے طنز و مزاح کے جو نمونے پیش کیے گئے وہ صرف ان کی کتاب "غبار خاطر" سے تھے جن میں ان کے انتیس مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار "الہلال" میں حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں اُن لوگوں پر طنز ہے جو ایک دن قبل تک مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے کے بدترین مخالف تھے مگر رات کو لفٹیننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد انہوں نے اپنی رائیں بدل دیں۔ مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی تین مضامین میں ملتا ہے۔

"اتنے میں خبر اڑی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور اُن نقرئی چھُری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ نہیں۔ شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اینست وابرو این و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم وجدید کو اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلد رات کو نہیں بلکہ صبح ۸ بجے سے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں!

ڈاکٹر سید محمود کی سخاوت سے متاثر ہو کر جب قلعۂ احمد نگر پر کوّوں کی یورش شروع ہو گئی تو ان سے کہا گیا کہ حضرت اگر ممکن ہو تو فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

"ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر دو معمّر و مسّن گدھ بھی تشریف لے آئے ہیں۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم ۔۔۔ توقیر کی صورتِ مجسّم

اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں،

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

پھر جب وہ لنگر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پر مولانا لکھتے ہیں:۔

"ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر تو ان کا مبارک قدم آیا ادھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ یاد آگیا

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب

قصد کعبہ کا نہ کیجئے گا برائے یُمنِ قدوم"

سے دو افتتاحیہ مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے
تفصیل سے لکھیں۔"

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور اندازِ بیان جس پر اُردو ادب
بجا طور پر فخر کر سکتا ہے

ثقیل ہوگی صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدے سے۔ مگر افسوس کہ دوسرے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا۔ طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے۔ نیز اگر بقراط طبی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لئے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں ثو بود رہتی ہے۔

دل از من، دیدہ از من، آشنیں از من، کنار از من

لیکن یہ جو کچھ ہوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیئے۔ آج کل ہماری نظریں (بحر مار مورہ) اور (دروانیال) کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ ادھر کی طرف دیکھیں۔ تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ملکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۶۔ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہیئے کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیر افکار و اعمال کی پہلی منزل تھیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں "صبحِ امید" کے عنوان

صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔ کہ ہمیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھاسکیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کرسکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ اپنے دل سے دور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک "بہت مشکل انسان" سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کا قاری اُن سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سننے کا متوقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود اُن کے ذہن میں تردّد اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا اثر اُن کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی "انفرادیت" ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے۔ نہ اُن کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف ان کی مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں

مولانا آزاد کی شخصیت

ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اُس اعتبار سے اُن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اس میں سے بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اس نے اُن کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہادیو ڈیسائی کی کتاب اور اُردو میں قاضی عبدالغفار کی "آثار ابوالکلام آزاد" شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اُترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اُردو ادب کے طالب علم بہ حیثیت ایک انشا پرداز، صحافی، طنز نگار اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطعِ نظر سوانح نگار کی حیثیت سے "آثارِ جمال الدین افغانی" کی ترتیب کے بعد اُن کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں خاصہ بلند تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انہیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قُرب بھی زیادہ حاصل رہا اور اس لئے اُن کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی

اس میں شبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کی انفرادیت نے ان کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ اسی "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہنما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انہیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور جواہر لال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں: "ان کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اسقدر بلند ہے کہ کوئی عامی اسے عام پیمانے سے ناپ تول نہیں سکتا ..... مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت جس کا خود انہوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اونچی دیوار بن گئی ہے۔" کون جانتا ہے کہ اگر یہ "اونچی دیوار" نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوئی ہوتی۔

"قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی توجیہہ غمگین احساس" سے کی ہے۔ اس معاملے میں انہیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمل خاں جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمل" شائع ہو چکی ہے، نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انہیں "حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا۔" اور اس لئے انہوں نے "ایک ایسی معنوی کیفیت کو پہچاننے کے کچھ اشارے پائے تھے۔" لیکن وہ مولانا کے اس قدر قریب کبھی نہیں" پہنچ سکے اور اس لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو ان کی تحریروں ہی میں "تلاش کرنا" ضروری

میں نمایاں ہوتے ہیں۔" مولانا کی اس "انفرادیت" میں سب سے زیادہ عنصر الملک کی مجیّر العقول "جینیس" کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے۔ "جب مولانا دُنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم وفضل اور تقدس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت ور "جینیس" کی بے پناہ قوتِ اجتہاد بھی لے کر آئے جس نے انہیں آباؤ اجداد کے حلقۂ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دُنیا کو ایک ایسی زبردست "انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اس ملک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی "جینیس" نے اُن کی "انفرادیت" کو جنم دیا اور ان کی انفرادیت نے ایک طرف ان کی شخصیت میں وہ حسن اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف ان کے قلم سے ایسے جواہر ریزے نکلوائے جنہوں نے اُردو زبان کو امر کر دیا۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو ان کے ادب میں جا بجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اس کا سُراغ پایا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں کھُل کھیلے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کیلئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنا اور اپنے "حبیبِ لبیب" اور "صدیقِ مکرم" سے "ہم کلامی" اور "مخاطبت" کی خوش وقتی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد "غبارِ خاطر" ہی سے لی ہے۔

جانشینوں کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلنا باعثِ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں ۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں ۔ اس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں بھی شکن آلود ہو جاتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کے اشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور الزام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے ۔ مگر وہ اس کی ذرا پروا نہیں کرتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں ، ان کے لئے وہ وقت البتہ بہت سخت ہوتا ہے جب اس ملک میں رہنے والے دو بڑے فرقے (ہندو اور مسلمان) اپنی سادہ لوحی کے سبب خود غرض رہنماؤں اور غیر ملکی حکمرانوں کا آلۂ کار بن کر باہم دیگر دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا جو نقشہ انہوں نے اپنے دفعِ عمل اور جرأتِ کردار سے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے ۔ اسی پر بس نہیں ہوتی بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کے دلوں میں ان کے خلاف بے سر و پا شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت اور رہنمائی کی خاطر انہوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں اور قسم قسم کے الزامات اٹھاتے تھے اُن سے واقعی بدظن ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہر قول اور ہر فعل کو مشتبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں گستاخی اور بدزبانی سے باز نہیں آتے ۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے کہ اپنے مخالفوں پر

ہوگیا" غالباً اس کی اصل وجہ یہ ہے ۔ کہ حکیم اجمل خاں کی شخصیت اتنی "مشکل نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی ۔

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "غمگین احساس" پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں اور ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "غمگینی" کا اصلی سبب کیا ہے ۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ پھر بھی " آثار" کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عجوبۂ روزگار تھی ۔ اسی طرح ان کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر چشم بینا کے لئے بڑا سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں ۔ ان کی پیدائش ایک خاص مشرقی بلکہ مولویانہ گھرانے میں ہوتی ہے ۔ انہیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی ۔ چوں کہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے گرد عقیدت مندوں اور ارادات کیشوں کا ایسا ہجوم رہتا ہے جو ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور ان کی طرف پیٹھ کر کے چلنا عذابِ الٰہی کا مستوجب سمجھتا ہے ۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں انہیں جو کچھ بننا چاہئے تھا اس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ابتدائی دور ہی سے وسیع النظری اور خدمتِ خلق کے مسلک کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر استخلاصِ وطن کی تحریک میں تن من سے شریک ہو جاتے ہیں ۔ یہاں انہیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے ۔ آزادئ ہند کی جدوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑھ چڑھ کر حصے لے رہے ہیں لیکن مسلمان من حیثیت القوم اس سے الگ ہیں اور سرسید اور ان کے

اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کلیات پکڑ نہیں سکتے ...... اس اشارے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے "مولانا کے ادب کی اس شاخ کے مطالعے سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت کا نقش ابھرتا ہے اس کے سب سے نمایاں اجزائے ترکیبی قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساس برتری" ہیں۔" یہ عقلیت اور INTELLECT کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔" یہ خودداری اور کم آمیزی" مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے۔ اس کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس "خودداری اور کم آمیزی" کی بدولت ہم نے کھویا کیا اور پایا کیا؟ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اوّل درجے کی "جینیس" میسر آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دور نکل گئے۔ لیکن ساتھ ہی ہم نے ایک ایسا عظیم سیاسی رہنما کھو دیا۔ اگر اس درجہ "خوددار اور کم آمیز" نہ ہوتا تو اس کا مقام کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے اس پہلو سے قاضی عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی بار بار آتا ہے اور وہ ہے ان کے مخالفوں کے ساتھ ان کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا کے مخالفوں نے انہیں عوام کی نظر سے گرانے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے اور ہر طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی زبان یا قلم

کچھ اچھالیں اور انکی برائی کا بدلہ برائی سے دیں اس لئے کہ یہ اُن کی شانِ استغنا اور شخصی عظمت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ " ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے!) اپنے وجودِ معنوی کو بند " کر لیتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں سے اتنے دور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لئے سوائے اس کے چارۂ کار نہیں رہتا کہ " ان کی فطرت کے تقاضوں کو ان کی تحریروں ہی میں تلاش " کرنے کی کوشش کریں! ظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تحریروں پر بھی پڑتا ہے اور ان کی فطرت کا " غمگین احساس " جسے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرزِ عمل سے بہت تقویت پہنچی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گداز پیدا کر دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ " مولانا نے " غبارِ خاطر " کے اوراق میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشان دہی فرما دی ہے، وہ " انانیتی ادب " کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نامزد فرماتے ہیں۔ مولانا نے " انانیتی ادب کے سلسلے میں دنیا کے مختلف نامور ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا نام بھی کافی اونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اردو ادب میں تو بقول قاضی عبدالغفار، کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں" دوسری زبانوں کے " انانیتی ادب " کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا ہی کی تحریروں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ " انانیتی ادب کے اخص الخواص ایسے افراد ہوتے ہیں جن کا ادب عام ترازو میں تولا نہیں جا سکتا

کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا ۔ جتنے زخم خود ان کی گمراہ " قوم " نے ان کے طلاد دماغ پر لگائے ۔ مگر انھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک حرف بھی زباں پر لائے بغیر گوارا کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی نفسیاتی کیفیت کو بھی تھا ۔ اپنی نفسیاتی خلوت میں انہوں نے اپنے سے کم درجے کی مخلوق سے شکوہ شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا ۔ ۔ ۔ اُس احساس خودی اور علم و فضل کی اس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد ہے ان کو ہمیشہ دماہم عام سے علیحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک پر تمکین (وغیور) خاموشی تن تنہا ان یورشوں کا مقابلہ کر سکی جو سالہا سال ہر قدم پہ اُن کا راستہ روکتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد پر رہے جو " لیگ " سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے ۔ ۔ ۔

تو اس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے ۔ " قائد اعظم نے " انہیں " شو بوائے " کا خطاب عطا فرمایا ۔ ۔ ۔ جتنی گالیاں انہیں دی گئیں شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں ۔ ۔ ۔ اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گزرے ۔ " اس سلسلے میں میں نے اتنے طویل اقتباسات اس لئے دیئے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح

کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اُن کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جتنا بڑا کام کیا ہے اس میں اُن کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی ہی کا لیا جا سکتا ہے۔ اس عارفانہ یکسوئی کے مظاہرے میں ان کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں "رائے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں الجھنے کو انہوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر مغائر سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصورات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فضل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔"

مولانا آزاد کی طرح قاضی عبدالغفار بھی فرقہ واریت کے بہت بڑے دشمن ہیں اور اس لئے جہاں کہیں ان کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نقش آرائی کرتا ہے وہاں اس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل بوٹے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ تعمیر ایک دفعہ پھر مسمار ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری تعصبات کی آگ روشن کر دی ... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے، لیکن مولانا خود اپنی "قوم" کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ ان کے وجود معنوی

اُس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسا "انسانی رنگ" HUMAN TOUCH دے دیتا ہے۔ جس سے وہ بصورت دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" کے ایک خط میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یہ "لوہے اور پتھر کا انسان" جب ایک حسین اور بیباک لڑکی سے متصادم ہوا تو اس کا اِس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین و ایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب تک اورنگ زیب کو ایک سادگی پسند اور باوقار بادشاہ، بہادر اور ہوشیار سپہ سالار اور سخت گیر اور بے لچک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لئے جب ہماری نظر کے سامنے اس کی زندگی کا یہ "تضاد" آتا ہے تو ہمیں حیرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لئے اُس کی شخصیت میں ایک ایسا حسن اور دلربائی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ متضاد عناصر کے تصادم" نے اُسے کس طرح متحرک DYNAMIC بنا دیا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان متصادم عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ "مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں بار بار بیان فرماتے ہیں۔ "غبارِ خاطر" کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے بیراگی کے شوق کو ...... سامنے لاتے ہیں۔" آگے چل کر وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے ان تضادات

میرا بھی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے سب سے اہم اُن کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں اُن کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ غیروں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کھا کر بھی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو اپنوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی بھلائی کے لئے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور ان کو بھڑکانے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اوّل تو غیر ملکی حکومت کی کاسہ لیسی میں گزری ہے ورنہ کم از کم ذاتی عافیت کوشی کی خاطر قومی زندگی کی ہماہمی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی نہ گزر جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا اور دوسری طرف اپنے زبان و قلم کو مخالفت کی آلودگی سے ملوّث نہ ہونے دینا اتنا بڑا کام ہے جس کی مثالیں تاریخ میں ڈھونڈنے سے دو چار ہی مل سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی انفرادیت نے اسے عام سطح سے بہت بلند و بالا مقام پر متمکن کر دیا ہو۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور بامقصد ہوتی ہے اتنی ہی اس راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے کامران گزرنے کے لئے انسان کو جو جد و جہد کرنی پڑتی ہے وہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اُجاگر کر دیتی ہے۔ جنہیں تضاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد

سے درخواست کریں تو انہیں بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے لئے رہا کیا جاسکتا ہے لیکن اُن کی خودداری انہیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور باوجود سے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر غیر ملکی حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قلب و جگر پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے ہیں کہ روز مرہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے، یہاں تک کہ جیل کے ساتھیوں کو بھی جن میں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود، حقیقی واردات قلب سے آشنا کرنا پسند نہیں فرماتے، البتہ ایک "غائب از نظر، ہم نشین دل" کے نام ان واردات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور مرتسم کرتے جاتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ انہیں ان مکتوبات کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا پورا یقین نہیں ہے۔ اس زمانے میں مولانا کے محسوسات کتنے شدید تھے اور انہیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ، بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے ..... قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش بھی جسم و صورت کی تھی، قلب

کی وضاحت کیوں ضروری خیال فرماتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مولانا کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ عوام ان کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس سے یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رُخ کیوں کر ممکن ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے" مولانا کی شخصیت کے اس "تضاد" پر بھی ان کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں : "زندگی کے حقائق کو وہ بار بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک لفظ ان کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے... مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازنِ ذہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت کو باقی نہیں رکھ پاتا لیکن مولانا آزاد اس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب گزرتے ہیں۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں انہیں اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومت برطانیہ

سجا چکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اس لئے مذہب ان کی گھٹی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انہیں مذہب کا جو تصوّر ملا تھا وہ بہت جامد اور بے رُوح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حصّے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے؟ زندگی کے ابتدائی دَور ہی میں ان کے دل میں شک کا کانٹا چبھا اور اُس کی خلش اتنی بڑھی کہ اس نے انہیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا، مگر مولانا قدرت سے طبعِ سلیم اور فکرِ رسا لے کر آئے تھے۔ اس لئے اُن کے قدم یہاں رُک نہیں گئے بلکہ جلدی ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصود ہے۔ جس عمر میں دوسرے لوگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں، اس عمر میں مولانا سفر کی تکان دُور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خاصی طویل بحث کی ہے لیکن چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مولانا کی انفرادیت ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مذہب اسلام کو عورتوں کی ترقی، موسیقی کے ذوق، جہادِ حرّیت، متحدہ قوم کی تشکیل اور غیر مسلم موحّدین کی نجات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے ان عقائد کے اظہار میں انہیں ایک طرف جُبّے اور عمامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑا۔

کسی شخص کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے اس کے ہم عصروں سے اس کا مقابلہ و موازنہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے

زیادہ طن کی تنظی پر جسم کو میں نے ملنے سے بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہر حال جو وقت آنا تھا آ گیا۔ یہ خبر پڑھ کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن ان کی انفرادیت اس جاں گسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اس کا حال سنئے :۔ "سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں ان میں فرق نہ آنے پائے .... چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے پابند ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا .... یہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔" یہاں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت میں آمد Spontaneity باقی نہیں رہی، بلکہ اسے قائم رکھنے اور بروئے کار لانے کے لئے انہیں خاص طور پر جد و جہد کرنی پڑی اور اسی کا دوسرا نام تصنع اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی عبد الغفار نے بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔ "ضبط و تحمل بھی اسی انفرادیت کے سرفراز و قائم رکھنے کی گویا ایک بناوٹ ہے .... اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے اس موقع پر اپنے ظاہر کو باطن سے متاثر نہ ہونے دیا۔" اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی، بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کے تصنع اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کرنا ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہ و مہ اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انہیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ لکھا

پُل نہیں باندھا جا سکتا ..... مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقّاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ان کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا (آزاد) بعض اوقات دوسروں پر اس لئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کمتری نہیں بلکہ ایک بہت ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر اقبال عملی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکّر تھے اور اس لئے اُن کا موازنہ مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دنیا ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک ہے وہ رمزِ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں :-

"اقبال رمزِ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بتاتے ہیں اور اسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفۂ حیات اقبال کے تصوّرات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے زیادہ "مذہبی" ہونے کے باوجود خودشناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتّیٰ کہ ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں ...... اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوتِ عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اس قوتِ نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے ..... اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصوّر سے

ماحول میں رہ کر ایک جیسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا تو ہمیں ان کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کا مقابلہ و موازنہ ان کے دو جلیل القدر ہم عصروں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہی دو بزرگ ایسے ہو سکتے تھے جن سے مولانا آزاد کا موازنہ کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں یہی تین شخصیتیں ایسی میسّر آئیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح متّصف تھیں اور جنہوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے جان دار اور صالح روایتیں قائم کیں۔

مولانا محمد علی ایک عملی انسان تھے اور اُن کا "عشق" "انہیں آتشِ نمرود میں کو دجانے کے لئے آمادہ رکھتا تھا لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر متمکّن نہیں تھے اور اس لئے اُن میں ضبط و تحمل اور استقلال و استقامات کے وہ بلند پایہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے جو مولانا آزاد کی انفرادیت کے سب سے روشن مینارے ہیں۔ اسے" قاضی عبدالغفار اس طرح لکھتے ہیں:" مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے اور ایک عمومی لیڈر کی طرح اپنے بادبانوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے مولانا (آزاد) اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بے گانہ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی ان دونوں کے طرزِ فکر میں کوئی نقطۂ اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی

مولانا ابوالکلام آزاد سے ایک ملاقات

دیوان سنگھ مفتون

ایڈیٹر "ریاست" گو زندگی بھر مولانا آزاد کا معترف و مدّاح رہا اور مولانا کی تحریروں کا یہ تو ہی اس کو صحافتی دنیا میں لانے کا سب سے بڑا باعث تھا۔ مگر یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ اس سال یعنی ۱۹۵۸ء کی یکم جنوری سے پہلے اسے کبھی بھی مولانا کی کوئی تقریر سننے یا مولانا سے ہمکلام ہونے کا موقع نصیب نہ ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ ایڈیٹر "ریاست" نے بہت ہی کم اور کبھی ہی کسی کانفرنس یا جلسہ میں شرکت کی۔ مولانا فطرتاً ایک تنہائی پسند شخصیت تھے۔ اور ایڈیٹر ریاست بھی اب کئی برس سے بیس بیس روز اور ایک ایک ماہ تک اپنے گھر سے باہر نہیں جاتا۔ اور اب یہ تنہائی میں ایسا ہی لطف محسوس کرتا ہے۔ جیسے کوئی پرندہ طویل عرصہ تک کسی پنجرہ میں رہنے کے بعد اپنے قفس کو چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔ اور مرحوم سیّد اکبر الہٰ آبادی کے اس شعر پر عامل ہو سے

... اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے ...... اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا، انسان کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے۔"

مولانا آزاد کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی عبدالغفار نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اس کوشش میں انہوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "غبارِ خاطر" سے لی ہے۔ لیکن انہیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انہوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمو دی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دشوار گزار ہو گئی ہے اور مغالطے سنگِ راہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی شعریت نے ایک چادر بن کر ان کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی!" کچھ اسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی عبدالغفار سے بھی ہے۔ جو کسر مولانا کی شعریت سے باقی رہ گئی تھی اسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور "تنقید اور تبصرے کی راہ" اور بھی دشوار گذار ہو گئی۔ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ "آثارِ ابوالکلام آزاد" مجموعی طور پر ایک عظیم اور مشکل شخصیت کو سمجھنے اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کی خاصی کامیاب کوشش ہے۔ اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر عقیدت کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا جاتا اور مشکل شخصیت کا تاثر پہلے ہی سے ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

مطلب یہ تھا کہ کتاب آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ ملیح آبادی صاحب مرحوم مولانا سے مل کر واپس آئے تو انہوں نے ٹیلیفون پر بتایا کہ کتاب مرحوم مولانا کے پاس تپائی پر پڑی تھی اور مرحوم نے ایڈیٹر "ریاست" کی بار بار تعریف کی اور ایڈیٹر ریاست سے ملنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ ایڈیٹر ریاست کیلئے مفید ثابت ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ایڈیٹر ریاست نے کہا کہ اب جب پھر مولانا کے ہاں جائیے تو کوئی وقت مقرر کر لیجئے۔ جب وہ حکم دیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ مولانا کا نیاز حاصل کرنا میرے لئے عزت اور سعادت کا باعث ہوگا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ملیح آبادی صاحب مولانا سے پھر ملے تو مولانا نے ان سے فرمایا کہ مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب سے ٹیلیفون کر کے ملنے کی تاریخ اور وقت پوچھ لوں۔ چنانچہ اجمل خاں صاحب کو ٹیلیفون کیا، تو آپ نے مولانا سے دریافت کر کے جواب دیا کہ یکم جنوری کو صبح ساڑھے نو بجے ملنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ میں اس سال کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے کے قریب مولانا کی کوٹھی پہنچ گیا۔ اور ٹھیک ساڑھے نو بجے اجمل خاں صاحب نے مجھے مولانا کے کمرے میں بھیج دیا۔ میں جب کمرہ میں داخل ہوا اور مولانا کو سلام کیا تو مولانا نے اپنے قریب اور سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور اس وقت جو بات چیت ہوئی وہ کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے اور وہ بات چیت یہ تھی۔

ایڈیٹر ریاست :- یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج میں آپ جیسی بلند ترین شخصیت سے ملنے اور ہمکلام ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے صرف ایک بار الہ آباد میں مرحوم پنڈت موتی لال نہرو کی کوٹھی پر آپ کے

پر شکستہ ہوں قفس میں نہ رہا ذوقِ چمن
ولولے دل کے گئے قوتِ پرواز کے ساتھ

چنانچہ گو مرحوم مولانا سے ملنے اور ہمکلام ہونے کا کبھی اتفاق نہ ہوا مگر اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ آپ ایڈیٹر "ریاست" کے بہت بڑے مداحوں میں سے ہیں اور "ریاست" سالہا سال سے مسلسل اور شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور آپ نے بعض لوگوں سے ایڈیٹر "ریاست" کی تعریف کی۔ ایڈیٹر "ریاست" اور مولانا کے اس تعلق یا بے تعلقی کی کیفیت میں اسی پچھلے دسمبر کا ذکر ہے کہ جب کتاب "ناقابل فراموش" شائع ہوئی تو اس کتاب کی جلد مولانا کو بھی بھیجی گئی اور ساتھ خط لکھا گیا کہ اگر آپ اس کتاب کو کبھی فرصت کے وقت ملاحظہ فرمائیں گے تو یہ ایڈیٹر "ریاست" کے لئے عزت اور فخر کا باعث ہوگا۔ اس کتاب کے مرحوم مولانا کے پاس پہنچنے کے بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مولانا ملیح آبادی مولانا آزاد کے ساتھ "الہلال" اور "البلاغ" میں سالہا سال تک کام کرتے رہے ہیں اور اب چونکہ آپ دہلی میں ہیں آپ مرحوم مولانا سے ملنے ہفتہ عشرہ میں ضرور جایا کرتے تھے۔ اور شاید اس وقت صرف دو شخصیتیں یعنی مولانا ملیح آبادی اور مرحوم مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر محمد اجمل خاں ہی ایسی ہیں جو مرحوم مولانا کے ساتھ سالہا سال تک رہے اور جن کو مرحوم مولانا کی سب سے زیادہ قربت حاصل تھی)۔ آپ سے ملنے گئے تو آپ نے ملیح آبادی صاحب سے ایڈیٹر "ریاست" کی بار بار تعریف کی۔ اور ملیح آبادی صاحب نے دیکھا کہ کتاب "ناقابل فراموش" آپ کے پاس چھوٹی تپائی پر پڑی ہے۔ جس کا

اُردو اخبار جاری کرنے والے تھے۔ تو میں اور خواجہ صاحب آپ کا نیاز حاصل کرنے مرحوم حکیم اجمل خان صاحب کے ہاں گئے تھے جہاں کہ آپ مقیم تھے۔ اخبار کا نام ابھی زیر تجویز تھا اور آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ اخبار کا نام کیا ہوگا تو خواجہ صاحب نے بتایا کہ "غریبوں کا اخبار"۔ یہ سنکر اور اخبار کے نام کی طوالت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے طنزاً فرمایا تھا کہ ابھی یہ نام بہت مختصر ہے نام ہونا چاہیے "غریبوں کا اخبار قیمت ایک آنہ" چنانچہ آپ کے طنز کے باعث ہی مختصر نام "ریاست" تجویز کیا گیا تھا۔

مولانا :۔ مجھے یہ واقعہ یاد نہیں۔

ایڈیٹر ریاست :۔ میرے حاضر ہونے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں کچھ پرانے کاغذات آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ یہ کاغذات غدر کے زمانہ کے ہیں جو بہادر شاہ بادشاہ کے سمبندھی مرزا الٰہی بخش کے خاندان کی ایک خاتون نے مجھے بطور امانت رکھنے کے لئے دیئے جبکہ وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلی گئی تھیں۔ پاکستان جانے کے بعد اس خاتون کا وہاں انتقال ہوگیا۔ (یہ کہتے ہوئے میں نے یہ کاغذات مولانا کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ ان کاغذات میں کچھ تو اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ ڈلہوزی کے خطوط ہیں کچھ اس زمانہ کے سیکرٹریوں کی چٹھیاں۔ کچھ نکاح نامے اور کچھ مولویوں کے جائز و ناجائز اولاد کے متعلق فتوے۔ کیونکہ بہادر شاہ کے خاندان میں یہ جھگڑا رہتا تھا کہ فلاں اولاد بغیر نکاح کے پیدا ہوئی جو ناجائز ہے۔ اور فلاں نکاح کے بعد جو جائز قرار دی جاسکتی ہے۔ اور اس

نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا۔ پنڈت جی کے بھتیجے شام لال نہرو ممبر مرکزی اسمبلی میرے دوست تھے ان کے ہاں تھا تو وہ پنڈت موتی لال جی سے ملانے کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور آپ بھی اس وقت پنڈت جی کے ہاں تشریف فرما تھے۔

مولانا:۔ نہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک بار آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں سول لائنز کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا اور میں وہاں کھانا کھا رہا تھا۔ اور آپ بھی وہاں کھانا کھانے کے لئے آئے تھے (میں یہ سنکر مولانا کی قوت یادداشت کے متعلق حیران رہ گیا۔ کیونکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ بہت برس ہوئے میٹکاف ہاؤس کے قریب ایک کوٹھی میں سر کیلاش نرائن ہکسر کے بھائی کے داماد کا ایک ہوٹل تھا جس کا نام غالباً ملٹری ہوٹل تھا۔ میں اس ہوٹل میں رات کو ڈنر کھایا کرتا تھا۔ اور اس کے لئے غالباً ساٹھ روپے ماہوار دیتا تھا ایک روز رات کو میں ڈنر کھانے کے لئے وہاں گیا اور ہوٹل کے ایک خانہ میں داخل ہوا تو وہاں مولانا کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جب دیکھا کہ مولانا تشریف فرما ہیں تو میں فوراً ہی واپس آ گیا۔ اور دوسرے خانہ میں چلا گیا۔ مولانا سے نہ تو واقفیت تھی اور نہ کبھی اس سے پہلے کبھی بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور نہ کوئی بات ہوئی۔ مگر آپ کو یہ واقعہ بھی یاد رہا) ــــ

ایڈیٹر ریاست:۔ تو پھر میں نے اس ہوٹل کے واقعہ سے بھی پہلے ایکبار آپ کا نیاز حاصل کیا ہے۔ میں اور خواجہ حسن نظامی دہلی سے جب ایک روزانہ

ایڈیٹر ریاست :۔ اس کے علاوہ جو لوگ روپیہ سے محبت نہ کریں اُن کے پاس روپیہ رہا نہیں کرتا ۔

مولانا :۔ آپ نے بھی روپیہ سے زندگی بھر محبت نہ کی اور اسے خوب صرف کرتے رہے ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ میں روپیہ جمع کرنے کو زندگی بھر ایک کمینہ پن سمجھتا رہا ۔

مولانا :۔ میں نے سنا ہے کہ آپ مقروض بھی ہیں ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا جب میں مقروض نہ تھا ۔

مولانا :۔ اس وقت کتنا قرضہ ہوگا ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ اخبار کے ذمہ چھ ہزار روپیہ کے قریب ہے اور میرے ذمہ چار ہزار روپیہ کے قریب ۔ ایک دوست نے اخبار کا نصف قرضہ ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے ۔

مولانا :۔ اب اخبار میں نقصان کتنا ہے

ایڈیٹر ریاست :۔ ایک دوست اپنی فیاضی اور محبت کا ثبوت دیتے ہوئے کاغذ کے تمام مصارف ادا کر دیتے ہیں اور اس کے بعد غالباً اڑھائی تین سو روپیہ ماہوار کے قریب نقصان ہے ۔

مولانا :۔ آپ قرضہ اقساط کی صورت میں کیوں ادا نہیں کر دیتے ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ اقساط کے ذریعہ قرضہ تو تب ادا کیا جائے اگر منافع ہو۔ نقصان

سلسلہ میں مفتیوں کے فتوے حاصل کئے جاتے تھے ۔ مولانا ان کاغذات کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھتے رہے اور آپ نے یہ کاغذات اپنے پاس رکھ لئے ۔)

مولانا :۔ آپ کے اخبار کا آجکل کیا حال ہے ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ ایسا ہی حال ہے جیسا دوسرے اخبارات کا ۔ اب تو زمانہ اُن اخبارات کا ہے جن کی پشت پر کروڑ پتی سرمایہ دار ہوں اور جو لاکھوں روپیہ صرف کریں اور لاکھوں روپیہ ان اخبارات سے بطور تجارت فائدہ حاصل کریں ۔

مولانا :۔ آپ نے بھی تو اپنی زندگی میں اخبار سے بہت روپیہ پیدا کیا ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ جو روپیہ پیدا کیا وہ یا تو سابق والیانِ ریاست کے ساتھ مقدمہ بازی پر صرف ہوا اور یا اخبار کو زیادہ بلند لے جانے پر ۔ اخبار کی ضخامت ستر ستر صفحہ کی تھی ۔ اور بارہ بارہ صفحہ آرٹ پیپر پر تصاویر ہوتی تھیں ۔ بغیر روپیہ صرف کئے تو اتنا شاندار اخبار جاری نہ رکھا جا سکتا تھا ۔ اور مقدمات پر بھی پانی کی طرح روپیہ صرف ہوا ۔ صرف نواب بھوپال والے مقدمہ پر ہی میرا اسّی ہزار روپیہ اور نواب بھوپال کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا ۔

مولانا :۔ ہاں دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ۔

میں ختم ہو جائے گا ۔ کیونکہ پنجاب اور کئی دوسرے صوبہ جات کی گورنمنٹوں سے خط و کتابت ہو رہی ہے ۔ مجھے توقع ہے کہ یہ گورنمنٹیں کافی جلدیں خریدیں گی ۔

مولانا :۔ اگر آپ چاہیں تو میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کیرون سے کتابیں کافی تعداد میں خریدنے کے لئے کہہ سکتا ہوں ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ وہ میرے بھی سالہا سال کے گہرے دوست ہیں ۔ اور اطلاع آئی ہے کہ پنجاب گورنمنٹ کافی جلدیں خریدے گی ۔ اور مسٹر رندھاوا نے بھی خود ہی پنجاب گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ ایسی اچھی کتاب وہاں کی ہر لائبریری میں ہونی چاہئے ۔ آپ اس کے متعلق سردار پرتاپ سنگھ سے نہ کہئے آپ کی پوزیشن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہے ۔

مولانا :۔ کئی روز ہوئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہئے ۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے دو سو روپیہ ماہوار آپ کے لئے مقرر کرتا ہوں ۔

ایڈیٹر ریاست :۔ میں آپ کا اس کے لئے شکرگزار ہوں ۔ مگر بہتر ہوگا کہ آپ مقرر نہ کیجئے ۔ جس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ پنشن والے لوگ عام طور پر جلدی مر جاتے ہیں اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا ۔ اور دوسرے اگر گورنمنٹ نے پانچ سات یا دس برس کے بعد یہ پنشن بند کر دی تو پھر مجھے تکلیف ہوگی ۔

مولانا :۔ (مسکراتے ہوئے) نہیں پنشن پانے والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ جلدی مر جائیں ۔ لوگ بہت طویل عرصہ تک بھی پنشن پاتے ہیں ۔ اور میں اس کے

ہو تو اقساط کہاں سے آئیں ۔

مولانا : ۔ کیا اخبار ٹرسٹ کی ملکیت میں ہے ۔

ایڈیٹر ریاست : ۔ جی ہاں ۔ یہ اب ٹرسٹ کی ملکیت میں ہے ۔ مرحوم رفیع احمد صاحب قدوائی کے ایما سے یہ ٹرسٹ کے سپرد کیا گیا تھا اور مرحوم نے فرمایا تھا کہ آپ تیس ہزار روپیہ کا انتظام کر دیں گے ۔ تاکہ اخبار پھر اپنی پہلی شان حاصل کر سکے ۔ مگر مرحوم نے پانچ ہزار روپیہ کے قریب دیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ اس زمانہ میں اس کی تعداد یا اور ضخامت میں اضافہ کیا گیا تھا ۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے اس سال اس پر سترہ ہزار روپیہ کے قریب صرف ہوا جو دوستوں نے اور مرحوم قدوائی صاحب نے دیا ۔

مولانا : ۔ ٹرسٹی کون کون لوگ ہیں ۔

ایڈیٹر ریاست : ۔ ایک میر مشتاق احمد ۔ دوسرے سردار لچھمن سنگھ گل ٹھیکیدار اور میں ۔

مولانا : ۔ کیا یہ ٹرسٹی روپیہ کا انتظام نہیں کر سکتے ۔

ایڈیٹر ریاست : ۔ سردار لچھمن سنگھ نے تو ایک بار پانچ ہزار روپیہ دیا تھا ۔ میر صاحب کی مالی حالت مجھ سے بھی زیادہ گئی گزری ہے ۔

مولانا : ۔ کیا کتاب " ناقابل فراموش " کافی فروخت ہو رہی ہے ۔

ایڈیٹر ریاست : ۔ کتاب تو کافی فروخت ہو رہی ہے مگر جو روپیہ آتا ہے وہ دفتر میں ہی خرچ ہو جاتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اس کا موجودہ یعنی پہلا ایڈیشن دو ماہ

ہیں۔ چند لمحے آپ نے سوچا اور کہا اچھا آنے دو کیا حرج ہے میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ آپ بہت مصروف ہیں اور پنڈت جی بھی آ رہے ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے میں جانا چاہتا ہوں اس پر آپ نے کہا نہیں دس بجنے میں ابھی دس منٹ باقی ہیں تھوڑی دیر اور بیٹھئے۔ پھر باتیں شروع ہوئیں مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا بیٹھنا مناسب نہیں۔ پانچ منٹ گذرے ہونگے میں پھر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اجازت دیجئے میں جا رہا ہوں پنڈت جی آتے ہونگے اس پر آپ نے کہا اچھا جائیے مگر مجھے آپ سے ابھی بہت باتیں کرنی ہیں کسی روز پھر آیئے اور اجمل خاں سے ٹیلیفون پر وقت مقرر کر لیجئے۔ میں نے سلام کیا اور کمرہ سے باہر آیا تو دیکھا کہ باہر سڑک پر دوڑ دھوپ جاری ہے بھنگی سڑک صاف کر رہے ہیں اور چھ سات اصحاب پنڈت جی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں اپنی ٹیکسی میں واپس اپنے دفتر آ گیا اور راستہ میں سوچتا رہا کہ مولانا کا مرتبہ کس قدر بلند ہے کہ آپ وزیر اعظم سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی فرصت نہیں ایک گھنٹہ بعد آیئے۔

اس ملاقات کے بعد اطلاعیں آتی رہیں کہ کانگریس کے جھگڑوں مسٹر کرشنما چاری کے مسئلہ کے متعلق مولانا بہت مصروف ہیں میں نے فیصلہ کیا کہ اب گوہاٹی کانگریس کے اجلاس کے بعد وقت مقرر کرنے کے لئے اجمل خان صاحب کو ٹیلیفون کیا تو انہوں نے مولانا سے دریافت کر کے منگل کے روز صبح ساڑھے نو بجے کا وقت مقرر کیا یعنی یکم جنوری ۱۹۵۸ کو تو میری مولانا سے زندگی میں پہلی ملاقات ہوئی اور یہ

لئے انتظام کر رہا ہوں اور خود حکم لکھوں گا کہ یہ پنشن ہمیشہ جاری رہے۔ آپ کی زندگی میں کبھی بھی بند نہ ہو۔

ابھی یہ باتیں ہو ئی تھیں کہ آپ کے سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور آپ نے کہا کہ پنڈت جواہر لال جی کا ٹیلیفون آیا ہے وہ دس بجے ملنے کے لئے آ رہے ہیں یہ سُنکر مولانا نے اجمل خانصاحب سے کہا کہ جواہر لال جی سے کہدو کہ وہ گیارہ بجے آئیں میں ابھی باتیں کر رہا ہوں مولانا کا یہ جواب سنکر اجمل خاں صاحب تو پنڈت جواہر لال جی کو ٹیلیفون کرنے چلے گئے اور میں حیران کہ ہندوستان کا وزیر تعلیم یہاں کے وزیر اعظم کو کہہ رہا ہے کہ ابھی نہ آئیں وہ باتیں کر رہے ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ خلاف توقع نہیں کیونکہ پنڈت جواہر لال مولانا کی ایسی ہی عزت کرتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بزرگوں کی کرتا ہے اور مولانا بھی پنڈت جی کو اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔

ہم نے پھر باتیں شروع کی ہی تھیں کہ اجمل خاں صاحب پھر آئے اور انہوں نے بتایا کہ پنڈت جی تو اپنی کوٹھی سے چل چکے ہیں اور پنڈت جی کے سیکرٹری نے بتایا ہے کہ وہ پہلے رادھا کرشنن جی (بھارت کے نائب صدر) کے ہاں جائیں گے۔ اور وہاں سے یہاں تشریف لائیں گے یہ سن کر مولانا نے کہا کہ رادھا کرشنن جی کے ہاں پنڈت جی کو ٹیلیفون کر دو کہ میں ابھی معروف ہوں وہ گیارہ بجے آئیں اس پر اجمل خاں صاحب نے عرض کیا۔ کہ چند گز کے فاصلہ پر تو رادھا کرشنن جی کی کوٹھی ہے۔ پنڈت جی وہاں گیارہ بجے تک کہاں انتظار کرتے رہیں گے یہ سن کر مولانا نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی اور دیکھا کہ دس بجنے میں ابھی دس منٹ باقی

ایک محسن کی یاد میں

جگن ناتھ آزاد

از شمار دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

دسمبر ۱۹۵۳ء کی آخری تاریخوں کا ذکر ہے۔ جناب جوش ملیح آبادی نے ایک پرچہ لکھ بھیجا:- یکم جنوری ساڑھے آٹھ بجے صبح ملاقات مولانا آزاد ——————

شام کو جب کسی کام کے سلسلے میں جوش صاحب کے کمرے میں گیا تو اُن سے کہا کہ وہ پرچہ مجھے مل گیا ہے میں کل صبح آٹھ بجے آپ کے یہاں پہنچ جاؤں گا اور اکٹھے مولانا صاحب سے ملنے چلیں گے۔

"مجھے تو اُن سے ملنے نہیں جانا انہوں نے آپ کو وقت دیا ہے" جوش صاحب نے جواب میں کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ملاقات کا وقت لیا ہو۔ جب میں نے جوش صاحب سے کہا کہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مولانا نے کیوں ملاقات

منگل کی ملاقات دوسری اور آخری ملاقات تھی

اس منگل کے روز میں صبح مولانا کی کوٹھی پہنچا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے اُنکے کمرے میں داخل ہوا اور ٹھیک ساڑھے دس بجے یہ ملاقات ختم ہوئی یعنی اس روز ایک گھنٹہ کے قریب باتیں ہوتی رہیں اور ان باتوں میں حافظ محمد یوسف ایڈیٹر "شمع" مرحوم مہاراجہ نابھہ اور ان کی حقیقی والدہ کے تعلقات کی کشیدگی مرکزی گورنمنٹ کے بعض وزراء بخشی غلام محمد۔ راجکماری امرت کور، ڈاکٹر سیّد محمود اور بعض صوبہ جات کے وزراء کے متعلق ذکر ہوتا رہا اور شفقت و محبت کا آپ نے ان دونوں ملاقاتوں میں جو سلوک کیا اُس کا خیال کرتے ہوئے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ آئندہ ہندوستان کی اس محترم ترین شخصیت کو پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور اپنی اس کیفیت میں یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا ہندوستان کے ہر شخص کو اس محب الوطن، دیانتدار، بلند، لائق اور بے ریا شخص کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی کم مائگی کا احساس ہوا میری کیفیت اس وقت وہی تھی
جو علامہ اقبال رحمہ نے اس شعر میں بیان کی ہے ۔

من حضورِ آں شہِ والا گہر
بے ہنر مردے بہ دربار عمرؓ

میرے آداب عرض کے جواب میں مولانا نے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی کی طرف
اشارہ کیا اور اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے کہ مولانا کے حضور مجھے اُن کے قدموں
میں فرش پر بیٹھنا چاہیئے کرسی پر بیٹھ گیا ۔
ان کے بائیں طرف ایک دوسرے کے اوپر سگار کے متعدد ڈبے رکھے تھے ۔
اس وقت بھی وہ سگار پی رہے تھے ۔ میں نے یہ کہہ کر کہ یہ میرا مجموعۂ کلام ہے "بیکراں"
ان کی نذر کی ۔ آپ نے کتاب لے کر ایک سرسری سی ورق گردانی کی اور تھوڑی
دیر کے بعد بولے " مجھے یاد ہے آپ نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مجھے ڈاک سے
بھیجا تھا ، میں ان کی قوتِ حافظہ دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ کیونکہ انہوں نے جس بات کا
ذکر کیا تھا اسے چار برس ہو چکے تھے اور پھر میرے مجموعۂ کلام کا مولانا کے
پاس پہنچنا کون سی ایسی بڑی بات تھی ۔

نایاب نہیں متاعِ گفتار
صد الوری و ہزار جامی

اور مولانا کا یہ بات یاد رکھنا کہ میں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن انہیں ۔
ڈاک سے بھیجا تھا ایسی بات تھی کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔

کا وقت دیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ اجمل صاحب نے فون پر بتایا ہے۔ آپ نے وقت مانگا ہوگا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ کئی ماہ قبل اجمل صاحب سے میں نے کہا تھا کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کی آرزو ہے۔ ممکن ہو تو کبھی ملاقات کرا دیجئے گا۔ اس واقعہ کو کئی ماہ گذر گئے تھے، میں بھول چکا تھا۔ لیکن اجمل صاحب کو یاد تھا، انہوں نے ملاقات کے لئے وقت دلوا دیا تھا۔

کل مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ اس تصور سے مجھے مسرت بھی ہو رہی تھی اور ایک ہلکی سی گھبراہٹ بھی تھی کہ مشرق کے اتنے بڑے عالم سے ملاقات ہوگی تو مجھ ایسا کم علم کس موضوع پر گفتگو کرے گا۔ مولانا مشرقی علوم کے ایک بحر ذخار ہیں اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ خذف چینوں میں بھی اپنا شمار نہیں۔ خیر یہ تو دور کی بات ہے، مولانا نے آنے کا مقصد پوچھ لیا تو کیا کہوں گا صرف شوق دیدار۔ مولانا ایسی مصروف شخصیت کا وقت محض اس لئے جا کر ضائع کرنا کہ انہیں دیکھنے کی آرزو ہے، یہ بھی کوئی مستحسن نہیں لیکن ملاقات کا موقعہ مل رہا تھا۔ ایسے میں ہاتھ سے کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہی فیصلہ کیا کہ "شب گراں" کے نئے ایڈیشن کی ایک جلد لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ کہوں گا کہ یہ پیش کرنے کے لئے آیا ہوں انہی ملے جلے جذبات کو لئے میں اگلی صبح ۴۔ کنگ ایڈورڈ روڈ پر جا پہنچا اجمل صاحب نے اطلاع کرائی اور مولانا نے اندر کمرے میں بلوا لیا۔

ایک سادہ کمرے میں جس کا دروازہ پائین باغ میں کھلتا تھا مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مولانا کی پُر وقار شخصیت سارے ماحول پر اثر انداز تھی۔ کمرے

ہوا تھا۔ والد اور میں دونوں مولانا کے دولت کدے پر پہنچے۔ اس ملاقات میں مولانا کی باتیں والد صاحب سے ہوتی رہیں۔

والد پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں پروفیسر ہیں جس میں ہزاروں طلباء زیر تعلیم ہیں یہ کالج روزِ اوّل سے کشمکشِ موت و حیات میں مبتلا ہے۔ اگر ابھی تک یہ کالج چل رہا ہے۔ تو یہ مولانا کی خاص عنایت کا نتیجہ ہے ورنہ حالات اس ادارے کے لئے بہت سازگار نہیں رہے والد سے اسٹاف کے اراکین نے کہا تھا کہ مولانا سے آپ کالج کا ذکر ضرور کیجئے گا۔ والد نے موقع پاکر یہ ذکر چھیڑا۔ مولانا بڑی توجہ سے سنتے رہے اور بعد میں بولے کہ یہ تو فیصلہ ہے کہ یہ کالج بند نہیں ہوگا۔ اس سے ہزاروں مہاجر طلباء اور سینکڑوں اساتذہ وابستہ ہیں اسے ہم بند نہیں ہونے دینگے۔ آنند کمار صاحب اس کالج کی اہمیت مجھے تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ پھر کہنے لگے یہ کالج اہل پنجاب کی ہمت کا نمونہ ہے، مہاجرین کو اسی طرح اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ حکومت اس سلسلے میں پوری مدد دے گی۔

اس ملاقات میں دَورِ مخزن کے شاعروں اور ادیبوں کا بھی ذکر نکل نکلا۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے والد صاحب سے فرمانے لگے ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ذوقِ ادب ایک ہی گھر میں دو نسلوں تک چلا ہو۔ والد نے کہا ایسی مثالیں ملتی ہیں پھر انہوں نے میر انیس اور قبلہ جوش ملسیانی اور عرش ملسیانی کی مثالیں دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں مگر کم۔ سیاست میں تو ایسی مثالیں بہت ہیں۔ لیکن ادب میں کم۔ ہم چلنے لگے تو مولانا نے کہا کہ آپ مطمئن رہیئے کیمپ کالج بند نہیں ہوگا۔ مولانا کے ارشاد کے مطابق کالج تو بند نہ ہوا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد عمر کی بنا پر کالج سے والد کی سبکدوشی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اب کے والد پھر مولانا کے

میں نے عرض کیا کہ دوسرا ایڈیشن پہلے سے بہت مختلف ہے، اس میں متعدد غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جو پہلے ایڈیشن میں نہیں تھیں۔ اس لئے یہ کتاب دوبارہ پیش کر رہا ہوں۔

یہ ایک مختصر ملاقات تھی میں نے گذارش کی کہ ہم سے لکھنے والوں کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع حاصل نہیں ہیں، اگر آپ سیاسی مصروفیات سے کچھ وقت ہمارے لئے نکال سکیں تو ہم دو یا تین ماہ میں ایک بار پندرہ بیس یا پچیس کی تعداد میں آپ کے یہاں حاضر ہوں اور آپ کی ذات سے فیض حاصل کریں۔

کہنے لگے ہاں فیضی صاحب نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی۔ ذرا فرصت ملے تو میں اس طرف توجہ کروں گا۔ اور یہ فرصت مولانا کو زندگی بھر نہ مل سکی۔

دورانِ گفتگو میں اُردو کے سلسلے میں تحقیقی کام کا ذکر آیا تو آپ نے خاص طور سے مولانا غلام رسول مہر کا نام لیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں آج کل مہر صاحب بڑا کام کر رہے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ کس فقرے پر ایسا ہوا لیکن جلد ہی ان کا طرزِ تخاطب آپ کے عوض "تم" میں تبدیل ہو گیا۔ میں چلنے لگا تو آپ نے فرمایا، کیا تنخواہ پاتے ہو؟ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کی عنایت سے میں پبلیکیشنز ڈویژن میں ملازم ہوں اور اپنی تنخواہ بتائی۔ انہوں نے اظہارِ اطمینان کیا، میں آداب بجالایا اور اجازت طلب ہوا۔

یہ مولانا کی خدمت میں میری پہلی حاضری تھی۔ دوسری بار کوئی چھ ماہ بعد یہ سعادت حاصل ہوئی آپ کے والد کی کتاب "رباعیاتِ مرحوم" کا نیا ایڈیشن شائع

سات منٹ کے بعد ہم لوگ آ گئے۔

یہ ملاقات مولانا سے ایک خاموش ملاقات تھی، اس عظیم شخصیت کی خاموشی ایک تقریر سے کم نہ تھی۔ جسے اب الفاظ میں لانا شاید میرے لئے ممکن نہ ہو۔

بیماری کا حملہ اور دفتر کے کام میں یہ انہماک چہرہ نقاہت کے باوجود یقین کی تجلی سے جگمگا رہا تھا۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا ہے ؎

یقین مثل آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی

مولانا سے ملاقات کا بہانہ اس وقت پیدا ہوتا تھا جب میری یا والد کی کوئی نئی کتاب چھپتی تھی۔ چنانچہ اس عظیم شخصیت سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب "گنجِ معانی" کا نیا ایڈیشن چھپا۔ ملاقات کا وقت بالعموم صبح ہی کا ملتا تھا۔ اجمل صاحب نے ہمیں کہا کہ مولانا نے وقت تو دے دیا ہے لیکن آج وہ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ میں نے کہا کہ پانچ سات منٹ میں ہم لوگ اٹھ آئیں گے۔ کتاب ہی تو پیش کرنا ہے لیکن خلافِ توقع یہ ملاقات طویل ہو گئی۔ والد نے "گنجِ معانی" پیش کی۔ مولانا یہ کتاب اس زمانے میں دیکھ چکے تھے جب اس کا پہلا ایڈیشن لاہور کی مشہور فرم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز نے شائع کیا تھا۔ کہنے لگے کہ یہ کتاب ابھی چھپی نہیں تھی کہ سر عبدالقادر نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا جی ہاں قبلہ شیخ صاحب ہی نے اس کا دیباچہ لکھا تھا اور وہی دیباچہ موجودہ ایڈیشن میں بھی شامل ہے۔ آپ کتاب کی ورق گردانی کرتے رہے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولے کہ اس ضخامت کی کتاب کی قیمت سات روپے آٹھ آنے زیادہ نہیں ہے۔ میں حیران تھا کہ

پاس پہنچے، مولانا نے فرمایا کہ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے عمر کی بنا پر ریٹائر ہونے کا کیا سوال۔ آپ کی موجودگی تو کالج کے لئے باعثِ فخر ہے۔ میں اس سلسلے میں چانسلر کو چھٹی لکھونگا چنانچہ مولانا نے چانسلر یا وائس چانسلر دیوان آنند کمار کو چھٹی لکھی۔ خدا جانے مولانا نے چھٹی میں کیا لکھا لیکن وہ دن اور آج کا دن اس واقعہ کو کئی برس ہونے کو آئے ہیں والد کی سبکدوشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

مولانا کے انتقال سے چند روز قبل والد مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اب میں تھک گیا ہوں کالج میں مجھ سے کام نہیں ہوتا کسی دن مولانا سے ملیں تاکہ ان کا شکریہ ادا کریں اور اُن سے اجازت لے کر میں ملازمت سے استعفیٰ پیش کر دوں۔

استعفیٰ تو والد اب بھی دے دیں گے کیونکہ اس دور میں ملازمت سے مستعفی ہونا کونسی مشکل بات ہے۔ لیکن مولانا سے اجازت لینے کی آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔

مجھے تیسری بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع اس وقت ملا جب میں اپنا مجموعہ کلام "ستاروں سے ذروں تک" کا نیا ایڈیشن انہیں پیش کرنے کے لئے گیا۔ اب کے میں جوش صاحب کے ساتھ گیا تھا۔ جوش صاحب کے بھائی جناب رئیس احمد خاں بھی ساتھ تھے۔

اس قافلے میں ایک صاحب اور بھی تھے، جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مولانا علیل تھے، آپ بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور دفتر کی کسی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے کتاب پیش کی آپ نے لے کے رکھ لی۔ شگفتہ اور پرسکون چہرے پر اضمحلال کی کیفیت نمایاں تھی۔ جوش صاحب نے مزاج پرسی کی، ان سے مختصر بات ہوئی۔ اس دوران میں اجمل صاحب بھی کمرے ہی میں موجود رہے۔ میں اور رئیس احمد صاحب خاموش ہی رہے۔ پانچ

کتاب کی ایک خاصی تعداد خریدی اور کتاب چھاپنے کے بعد جو نقصان کا اندیشہ تھا مولانا کی عنایت سے مفقود ہوگیا۔

اس ملاقات میں میں نے ہندو پاکستان کے مصنفین کے ان نقصانات کا ذکر کیا جو دوسرے ملک کے ناشرین کی بدولت انہیں برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر پاکستان میں چھاپی جا رہی ہیں۔ کہنے لگے کاپی رائٹ ایکٹ میں اب ایک ایسی ترمیم کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے ناشرین ایک دوسرے کے ملک کی مصنفین کی کتابیں بغیر اجازت شائع نہ کر سکیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر دونوں ملکوں میں کتابوں کی آمد و رفت پر سے پابندی ہٹالی جائے تو بھی اس بدعت کا بڑی حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ پچاس روپے کے ایک پیکٹ سے زیادہ کی کتابیں (اور وہ بھی ڈاک کے ذریعے سے) ایک سے دوسرے ملک میں نہیں بھیجی جا سکتیں۔ قانون ایسا ہونا چاہیئے کہ براہِ راست بڑے بڑے ریلوے پارسل اور ڈاک کے ذریعے سے وی پی کے پیکٹ بھیجے جا سکیں۔ فرمانے لگیں، یہ پابندی جو تم بتا رہے ہو کس نے عائد کی ہے حکومت پاکستان نے یا ہم نے؟ میں نے کہا مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں لیکن غالباً یہ پابندی حکومت پاکستان کی عائد کردہ ہے۔ آپ نے بڑے اطمینان بخش لہجے میں کہا کہ میں دریافت کرونگا کہ پاکستان کے ساتھ جو کانفرنسیں ہوگی ہیں۔ ان میں کسی وقت یہ سوال پاکستان کے ساتھ اٹھایا گیا ہے یا نہیں، اور اگر اٹھایا گیا ہے تو اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس مسئلہ کا حل کرنا بہت ضروری ہے موجودہ صورت میں جس کتاب کے تین ایڈیشن چھپتے ہیں اگر یہ پابندی ہٹ جائے کہ اس کے کئی اور ایڈیشن چھپ سکتے ہیں اور مصنفوں کی پریشانی بڑی حد تک

اس قسم کی بات مولانا نے آج سے پہلے تو کبھی نہیں کی ۔ آج یہ کتاب کی ضخامت اور اس کی قیمت کا ذکر کیوں کر رہے ہیں ۔ بولے کس نے شائع کی ہے اور خود ہی ناشر کا نام دیکھ کر کہنے لگے ۔ یہ دہلی کتاب گھر کیسا ادارہ ہے ۔ میں نے عرض کیا جناب یہ ادارہ وادارہ کچھ نہیں ہے، یہ تو ایک فرضی نام ہے کتاب میں نے خود شائع کی ہے اور اس پر دہلی کتاب گھر کا نام لکھ دیا ہے ۔ جو کتاب میں خود شائع کرتا ہوں اس پر اسی ادارے کا نام لکھ دیتا ہوں ۔ اکثر و بیشتر ناشر معاملے کے صاف نہیں ہیں ۔ اس لئے مصنف اپنی کتابیں خود چھاپنے پر مجبور ہے حالانکہ یہ اس کا کام نہیں ہے ۔ مولانا نے ساری بات بڑی توجہ سے سنی اور مجھ سے پوچھا اس کی فروخت کا کیا انتظام ہے ۔ اب مجھے مفصل بات کرنے کا حوصلہ ہوا ۔ میں نے بتایا کہ ہم اپنی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ذریعے سے فروخت کرتے ہیں ۔ کیونکہ بہت نقصان اٹھانے کے بعد یہ ایک معاملے کا صاف ادارہ ہمیں ملا ہے لیکن یہ ادارہ کتابیں فروخت کرنے کے لئے ہم سے چالیس فی صدی کمیشن لیتا ہے ۔ اب اگر لاگت میں مصنف کی رائلٹی ۔ کم از کم پندرہ فی صدی بھی شامل کر لی جائے جس کا موجودہ صورت میں سوال نہیں پیدا ہوتا تو یہ کتاب چھاپ کر ہمیں صریحاً نقصان ہی ہوتا ہے ۔ کیونکہ کتابت و طباعت کا سامان روز بروز گراں ہوتا جا رہا ہے ۔ نیز کتاب کی خاصی تعداد بسلسلہ تبصرہ اور تحفہ تحائف کی نذر ہو جاتی ہے ۔

یہ ساری روداد سُن کر فرمانے لگے آپ صحیح کہتے ہیں ۔ جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے آپ مجھے ایک درخواست دیجئے میں اس کے لئے کچھ سوچونگا ۔ چنانچہ چند روز میں اس کتاب کے لئے درخواست دے دی گئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کے دو اداروں نے اس

ابوالکلام آزاد کا سفرِ آخرت

شورش کاشمیری

۱۸ر فروری کو دن بھر کوشش کی کہ کسی طرح دہلی پہنچوں۔ دل آواز دے رہا تھا کہ زندگی بھر جس کے خوشہ چیں رہے ہو۔ اس کے بچنے کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی ہیں۔

بقول
صبح گیا یا شام گیا

اخباری اطلاعات بھی انتہائی غمناک تھی۔ ۱۹ر فروری کو چھ بجے صبح حسبِ معمول چائے پی کر غلسخانہ میں گئے کہ ایکا ایکی جسم کے دائیں حصہ پر فالج نے حملہ کیا۔ اور بے بس ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے دوسرے ہی دن مایوسی کا اظہار کر دیا۔ ان کی اس رائے سے اخبارات بے خبر تھے۔ لیکن خبروں کی رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ——

- افق لالہ گوں ہو چکا   اور
- آفتاب ڈوب رہا ہے

اس دن انڈین ایر ویز کارپوریشن کا کوئی جہاز دہلی نہیں جا رہا تھا۔ ان کی سرویس

دور ہو سکتی ہے۔ اس ملاقات کے لئے ہمیں پانچ سات منٹ ملے تھے۔ لیکن یہ گفتگو تیس منٹ تک پھیل چکی تھی۔ ہمیں اس بات کا احساس تھا، چنانچہ یہ کہہ کر کہ آج آپ بہت مصروف ہیں ہم رخصت طلب ہوئے۔ باہر آئے تو صدر کانگریس شری ڈھیبر بھائی موجود تھے۔ ان سے معذرت کی کہ ہماری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔ وہ بولے نہیں۔ اس دربار میں شاعروں اور ادیبوں کو سیاست والوں پر ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ تھی مولانا مرحوم سے میری آخری ملاقات جو آج بھی میری نظروں کے سامنے اس طرح موجود ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

اور اس کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی صبح کو میں نے دور سے مولانا کے جسد فانی کو پھولوں میں لدا ہوا دیکھا جب لاکھوں ہندوستانیوں اور غیر ملکیوں کا ہجوم اسے فوجی گاڑی میں لٹا کر اس منزل کی طرف لئے جا رہا تھا جہاں ہر انسان کو ایک دن پہنچنا ہے۔

میری نظر کے سامنے لاکھوں انسانوں کا زار و قطار روتا ہوا ہجوم تھا۔ ریڈیو کا مبصر زندگی ہوئی آواز میں مولانا کے آخری سفر کی روداد سنا رہا تھا اور میرا دل علامہ اقبال کے ان شعروں کی جانب کھنچا جا رہا تھا:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

"مولانا دو بج کر دس منٹ پر اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں ——"

انا للہ وانا الیہ راجعون

فون ہاتھ سے چھوٹ گیا تمام جسم لرز اٹھا۔ میں جانتا تھا یہ حادثہ ہونے والا ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس حادثہ کے لئے تیار نہ تھا —— روتے دھوتے صبح ہوئی۔ انڈین ایرلائنز سے نشست حاصل کی اور ٹھیک گیارہ بجے کر پچیس منٹ پر ہمارا طیارہ والٹن کے ہوائی اڈے سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا ——

کوئی ساڑھے تین بجے ہندوستانی ٹائم کے مطابق ہم دہلی پہنچے تو دل کا غم فضا کو بھی محیط تھا۔ پولیس اور کسٹم کے ضابطے میں آدھ گھنٹہ اُڑ گیا۔ ٹیکسی لے کر جامع مسجد کے سامنے پریڈ گراؤنڈ تک پہنچے۔ تو راستہ بھر دیوار و در اشکبار نظر آتے تھے۔ ادھر ترکمان گیٹ سے لے کر دریا گنج کے طویل القامت کھلے بازار میں دونوں طرف اردو بازار تک انسانی سروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تمام مکانوں کی چھتوں پر سر و ماتم مچلیاں لے رہے تھے —— چاندنی چوک سے اس طرف اردو بازار کے حدود میں لال قلعہ اور جامع مسجد کے وسیع و عریض میدان تک انسان ہی انسان اُگ آئے تھے —— غرض آسمان اور زمین پر حسرت و ماتم کے سوا کچھ نہ تھا — ہم پہنچے تو جنازہ کی نماز ختم ہو چکی۔ مولانا لحد میں اتارے جا چکے۔ راجندر بابو اور پنڈت نہرو گلاب چھڑک کر ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ مٹی دے رہے تھے۔ پولیس کی زنجیروں سے الجھتے الجھاتے ہم لحد تک جا پہنچے۔ نالۂ لبکا کے سوا دامن میں کچھ نہ تھا۔ مٹی اٹھائی اور آنسوؤں میں بھگو کر نذر کی —— چاروں طرف گریہ و زاری کی آوازیں گونج رہی تھیں —— ہر کوئی رو رہا تھا —— —— لال قلعہ کی سُرخ سلیں، جامع مسجد کے گنائے ہوئے سفید گنبد سے کہہ رہی تھیں ——

پیر اور جمعہ کو لاہور سے دہلی نہیں جاتی —— پاسپورٹ تیار اور ویزا مل چکا تھا تمام دن اسی کشاکش میں گزرا گاڑی میں چلا جاتا تو اگلی صبح کو دہلی پہنچ جاتا۔ مگر اس وقت کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے سہ پہر کی افواہ سے مضطرب ہوکر دہلی فون کرنا چاہا۔ تو ایکسچینج سے پتہ چلا کہ دہلی کی تاریں معطل پڑی ہیں۔ گھر پہنچ کر کوشش کی۔ سوا پانچ بجے "الجمعیتہ" دہلی کے دفتر سے ایک چپراسی بولا۔ اس نے فون تو اٹھا لیا تھا لیکن افواہ کی تردید کے سوا کچھ نہ بتا سکا کبھی دوستوں کے نام فون بک کرا رکھے تھے —— مولانا کی کوٹھی سے ان کے بیٹو مسٹر پوری ساڑھے سات بجے شام بولے کہ اجل مولانا کے پاس ہے۔ پنڈت نہرو اور راجندر بابو بھی وہیں کھڑے ہیں۔ حالت اندوہناک ہے دعا کرو —— میجر جنرل شاہنواز اور مسٹر پربودھ چندر کے متعلق بتایا گیا کہ گھر سے باہر ہیں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی زبانی بتایا کہ —— زندگی موت کے راستہ پر ہے۔

طبیعت بے قابو ہوتی گئی۔ دس بجے شب پھر فون کیا۔ مولانا کے مکان سے کوئی صاحب بولے کہ حالت خراب ہو چکی ہے۔ اس وقت سورہ یسین پڑھی جا رہی ہے —— پھر اس کی ہچکی بندھ گئی اور فون ختم ہو گیا۔

یہاں لاہور میں "نوائے وقت" کے دفتر کو بار بار فون کرتا رہا۔ تمام رات اضطراب بڑھتا ہی گیا —— کوئی دو بجے شب دس منٹ کے لیئے خواب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی —— آنکھ کھلی تو دل نے شہادت دی کہ خواب کی تعبیر اس آخری عظمت کی رحلت ہے تیسری بار اڑھائی بجے مولانا کی کوٹھی پر فون ملایا گیا۔ تو وہاں ریسیور اٹھتے ہی نالہ و شیون کی آواز کانوں میں پڑی۔ ایک اجنبی آواز نے کہا،

۹۔ "خلوت پسندی کا یہ عالم رہا کہ مہینوں ساتھی وزراء کو ملاقات کا وقت نہیں دیتے تھے اکثر گورنر اور وزراء ملاقاتی کتابچہ میں دستخط کرکے چلے جاتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی میں پہلی تو ہفتہ میں دو بار ملاقات کے لیے خود آتے۔

۹۔ یاد نہیں رہا شاہ ایران کا ذکر تھا یا شاہ حجاز کا۔ بہرحال دونوں میں سے کوئی ایک۔ پنڈت نہرو نے انہیں ڈنر دیا۔ تو مولانا کو بھی آمادہ کرلیا کہ ابکی کھانے پر تشریف لائیں۔ امراء پیر ملن گئے۔ شاہنواز کہتے ہیں میں خود اس کھانے میں شریک تھا مولانا شاہ سے فرزدل انفرادی تمکنت کے ساتھ تشریف لائے اور بیٹھتے ہی فرمایا:۔

"جواہر کھانے میں تاخیر کیا ہے؟ میرے بھائی جلدی کرو۔" فوراً ہی کھانا لگا شوربہ پیا اور دعوت کے بیچ ہی میں سے اٹھ کر چلے گئے۔

اپنے ہاں شاہ حجاز؟ (بہرحال کسی شاہ کا ذکر تھا) کو کھانے پر مدعو کیا۔ راجندر بابو پہنچے۔ پنڈت جی پہنچے۔ غرض سب بڑے لوگ آگئے لیکن خود غائب۔ سیکرٹری نے مطلع کیا طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ ان کے بغیر ہی دعوت اختتام کو پہنچی۔

اس قسم کے دو چار اور واقعات سناتے ہوئے شاہنواز نے کہا ایک دفعہ تین دن پہلے ظاہر شاہ والئی افغانستان کے اعزاز میں دی گئی دعوت میں ——— بے حد شگفتہ تھے۔ ظاہر شاہ کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے تو اس روانی کے ساتھ گھل مل کر فارسی بول رہے تھے کہ شاہ کے چہرہ پر ان کی عظمت کے تاثر کا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ مولانا نے میز پر لگے ہوئے کھانوں کی تاریخ اور مسالوں کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا ذکر چھیڑ رکھا تھا۔ بالخصوص کوفتوں کی تاریخ بڑے شرح و بسط سے بیان کی۔ شاہ کو فارسی کے

گر ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پنڈت نہرو نے راجندر بابو کی بیمار صحت کو سہارا دیتے ہوئے کہا:

"جو کونپلوں کی معیت سے گھبراتا تھا۔ آج منوں مٹی کی گود میں ہے ———"

بھارتی صوبوں کے بعض گورنر، بھارتی یونین کے مرکزی وزراء اور مختلف ملکوں کے سفیر پھولوں کی چادریں چڑھا کر رخصت ہوتے جاتے تھے ———

کوئی پانچ لاکھ انسان جو میت کے ساتھ تھے۔ ایک دوسرے کے شانوں کو پھاڑتے ہوئے اس کوشش میں تھے کہ مٹی دے لیں جو زندگی بھر ہجوم سے گھبراتا رہا وہ موت کے بعد ہجوم کی عقیدت کے ہاتھوں میں تھا ———

علالت کا آغاز

اجمل خاں نے بتایا۔ صبح فالج گرتا ہے۔ گئی شام مولانا خلاف معمول کچھ زیادہ ہی سرد رہے تھے۔ کابینہ کے اجلاس سے فارغ ہو کر روزمرہ کے دفتری اوقات کی نسبت دیر سے پہنچے۔ تو چہرہ لشناش تھا۔ اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ صبح جان لیوا مرض کا شکار ہوں گے ———

پروفیسر ہمایوں کبیر سے پتہ چلا۔

"اس حادثہ فاجعہ سے دو ہی روز پہلے اپنے سوانح زندگی کا انگریزی مسودہ نظر ثانی کے بعد انہیں واپس کیا تھا ———"

میجر جنرل شاہ نواز نے جو مولانا کے آخری لمحوں میں پاس ہی تھے آپ کی تخلیہ پسندی کے واقعات سناتے ہوئے بتایا کہ:

اور اُن کی ہمشیرہ آرزو بیگم کے داماد محمد یوسف کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، مسٹر پربودھ چندر، خان محمد یونس خان، مولانا حفظ الرحمٰن، اور میجر جنرل شاہ نواز قریب قریب تینوں دن موجود رہے ۔ پنڈت جی اور راجندر بابو کچھ عرصہ کے لئے چلے جاتے ۔ لیکن بے چین ہو کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں واپس آجاتے تھے ۔

مولانا نے مرض الموت کا سارا عرصہ بے ہوشی میں گذارا ۔ آنکھیں کھولیں نہ لب ہلائے ۔ شاہنواز کہتے ہیں کبھی کبھار جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں سے آیاتِ قرآنی کے ورد کا سراغ ملتا تھا ڈاکٹروں نے ۲۱ ۔ کی صبح ہی کو اُن کے جسم کی موت کا اعلان کر دیا تھا ۔ وہ حیران تھے کہ جسم کی موت کے بعد دماغ کیونکر ۲۴ گھنٹے زندہ رہا ۔ اس "تضاد" میں بھی زندگی کی امید باقی تھی ۔ ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے انجکشن دینا چاہا تو مولانا نے آنکھیں کھولیں ۔ فرمایا ———

"ڈاکٹر صاحب اب اللہ پر چھوڑ دیجئے ۔"

پھر ۔ آنکھیں بند کر لیں ——— ادھر وسط شب سے پہلے حالت نازک سے نازک ہوتی گئی ۔ پنڈت جواہر لال پائنتی کی طرف آ کر کھڑے ہوئے تو آنکھوں کے نم کو سہارا دیتے ہوئے راجندر بابو نے کہا :-

مولانا صاحب ! پنڈت جی آگئے ہیں ۔

لیکن ابوالکلام موت سے لڑ رہا تھا ۔ راجندر بابو نے دوبارہ کہا سہ بارہ کہا ۔ چوتھی دفعہ مولانا نے آنکھیں کھولیں اور کہا :-

" ——— اچھا بھائی خدا حافظ ——— "

پنڈت نہرو آنسو ضبط نہ کر سکے ——— پائنتی کی طرف آ کر پاؤں کو چھو کر باہر نکل آئے

اتنے شعر سنائے کہ وہ جھوم جھوم گئے جو مہمان گرد وپیش بیٹھے تھے وہ کھانے کے بجائے انہی میں کھو گئے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ تین روز بعد اس متحرک علم پر کیا گزرنے والی ہے؟ - اختلاج قلب انہیں مدت سے تھا - اُن کی تحریروں میں دل کا ماتم نظر آتا ہے۔ جونہی فالج نے نقب لگائی ۔معاملہ چوپٹ ہوگیا - پنڈت جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد دس منٹ کے اندر اندر پہنچ گئے ۔۔۔۔ ڈاکٹر بدھان چندر رائے (وزیر اعلیٰ بنگال) کو فوراً ہی طلب کر لیا گیا - وہ طیارے سے آگئے - اس وقت عام خیال تھا کہ حملہ قابو میں آگیا ہے؛ مگر حالت دگرگوں ہوتی گئی - کوئی سنبھالا کارگر نہ ہوا ۔۔۔ ڈاکٹر بدھان چندر جا کر لوٹے۔ وقت کے بہترین معالجوں نے ہزار ہا جتن کیے لیکن ۔۔۔ ع

ملک الموت کو بہ ضد تھی کہ جاں لے کے ٹلوں

ع۔ دوائیں بیکار ٭ دعائیں بے اثر اندازہ

موت کا معاملہ عالم و عامی سے یکساں ہے ۔۔۔ ۱۲ کی سہ پہر کو پنڈت جواہر لال نہرو بابو راجندر پرشاد، پنڈت گوبند بلبھ پنت میجر جنرل شاہ نواز، ڈاکٹر سید محمود ہمایوں کبیر، محمد یونس خاں بخشی غلام محمد، پروفیسر ہمایوں کبیر وغیرہم کو یقین ہوگیا کہ عظمت موت کے دروازے پر کھڑی ہے - چنانچہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی تحریک پر لال قلعہ اور جامع مسجد کے قلب کی پریڈ گراؤنڈ میں سرمد شہید کی قبر کے عقبی میدان کو قبر کے لیے منتخب کیا گیا - آغاز شب میں پنڈت نہرو ، مولانا حفظ الرحمن کے ہمراہ وہاں پہنچے اور قبر کی جگہ متعین کر کے آگئے۔

تیمار دار

اس مرض الموت میں مولانا کے پاس ان کے سیکرٹری اجمل خاں ان کے بھتیجے نورالدین

ان کے دوسرے رفقاء کی طرح پنڈت نہرو کا خیال تھا۔ کہ مولانا زندگی بھر
لوگوں سے دامن کشاں رہے ہیں۔ لہٰذا یہ جنازہ عوام کی بھیڑ کے بجائے
خواص کے ہجوم میں اٹھے گا ——— لیکن
رحلت کا اعلان ہوتے ہی کوئی دو لاکھ کے قریب لوگ کوٹھی کے باہر جمع ہو گئے۔ گریہ
و بکا کا طوفان بڑھتا رہا۔ لوگوں کے غول لگاتار چھ گھنٹے تک قطار اندر قطار کوٹھی کے صحن میں اپنے
عظیم الشان راہنما کی آخری زیارت کے لیے آتے ہی گئے ——— ہر مذہب، ہر عقیدے، ہر فرقے کے
انسانوں کا سمندر جوار بھاٹا دینے لگا۔ ہندو سکھ عورتیں اور مرد نعش کے پاس سے گزرتے تو
دونوں ہاتھ باندھ کر نمسکار کرتے۔ ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ ایک طرف ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ
ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے [illegible] ہند تصویر غم بنے
کھڑے تھے۔ جیسے وہ اس دن کے لیے جینا نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف لوگ
آنسوؤں کی مالائیں چڑھاتے گزرتے جاتے تھے۔ کئی ہزار برقعہ پوش مسلمان خواتین آزادی کے
بعد پہلی دفعہ [illegible] ——— اس طرح یکجا اور اشکبار نظر آرہی تھیں۔ جب وہ مولانا کی
میت کے پاس سے گزرتیں۔ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگتیں ——— "مولانا آپ بھی
چلے گئے ہیں کس کے سپرد کیا ہے" ——— اور مولانا کا سنجیدہ چہرہ اب بھی صدا دے
رہا تھا ———

○ ایمان کی سانگی کا نام موت ہے۔ تم سے شاہجہانی مسجد کے مینار جھک
کر سوال کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ کے صفحوں کو کہاں کھو دیا ہے! کبھی انہی
راہوں سے تمہارا قافلہ گزرتا تھا ——— تمہاری تاریخ انہی راستوں میں

میں ڈال گئے۔ مولانا کی حالت غیر سے غیر ہوگئی عشاء کے وقت سے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد میاں، مفتی عتیق الرحمٰن، سید صبیح الحسن، مولانا شاہد فاخری اور کئی علماء و حفاظ کلام الٰہی پڑھ رہے تھے۔

ڈوبتی رات کے ساتھ سورۂ یٰسین پڑھی گئی۔ بالآخر سوا دو بجے شب موت نے اس عظیم انسان کے لئے اپنا دامن وا کر دیا جو اس گئے دور میں سب سے بڑا مسلمان تھا۔ اللھم اغفرلہ، اللھم اغفرلہ، اللھم اغفرلہ

:- کنگ ایڈورڈ روڈ کی کوٹھی سے آگے سینکڑوں لوگ ٹھٹھرتی ہوئی رات کو اپنے دل کی آگ سے گرمی پہنچا رہے تھے جب لوٹتی ہچکی نے ان کے کان میں کہا۔

"—— تمہارا مرجع ارادت اپنے اللہ کے پاس چلا گیا ہے ——"

تو کہرام مچ گیا دہلی نے آخری بار سر جھکا دیا کہ اس کی عظمت کے طاق پر جلتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی ہے ——

:- تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کے ساتھ اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا اور جہاں جھنڈے جھکا رہے تھے وہاں لوگوں نے اپنے دلوں کے پرچم جھکا دیئے —— کہ اس دور کا ابن تیمیہ رحمت خداوندی کی گود میں جاتا ہے ——

ماتم ہی ماتم

آناً فاناً موت کی خبر ہندوستان کی وساطت سے تمام دنیا میں نکل گئی۔ ہندوستان دیکھتے ہی دیکھتے تعزیت کدہ نظر آنے لگا۔ دہلی میں کاروبار بند ہو گئے۔ حتیٰ کہ بنکوں میں بھی ہڑتال ہوگئی۔ راویوں کا کہنا ہے کہ اتنی عظیم ماتمی ہڑتال دہلی میں شاذ ہی ہوئی ہے۔

سکتے ہوتو مولانا کو بچا لیتے ——— "

پربودھ کہتے ہیں ——— یہ کہہ کر پنڈت جی بلک بلک کر رونے لگے ۔ پون بجے میت اٹھائی گئی ۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا ۔ جب کلمۂ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفراء کاندھے دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔ پنڈت نہرو، جنرل شاہ نواز، خان محمد یونس خان، مولانا حفظ الرحمٰن، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پربودھ چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطہ سے باہر میت کو توپ گاڑی پر رکھا ——" راشٹرپتی راجندر بابو باوجود دمہ کا مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویر یاس بنے کھڑے تھے ۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہا:

" آج ۴۰ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہوگیا ـــ " پنڈت پنت نے درد سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے ——— !

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی ۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی کھچڑی داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اٹھے ۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون تیرنے لگے ۔ راجندر پرشاد، رادھا کرشن اور سفراء و وزراء نے آخری دعائیں کیں ۔

مولانا کی بڑی بہن آرزو بیگم نے کوٹھی کی چھت سے بھائی کی میت پر آخری نظر ڈالی اور کہا ـــ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی ہے ———

جنازہ کی گاڑی میں مہر چلنے کی سمت دائیں رخ پر پنڈت نہرو اور بائیں رخ پر مسٹر ڈھیبر (صدر کانگریس) کھڑے تھے ۔ پنڈت نہرو کے سامنے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

بکھری پڑی ہے۔ اس جمنا نے تمہارے اسلاف کو وضو کے لیئے پانی
دیا اور اسی سرزمین نے تمہاری جاندار اذانیں سُنی تھیں ——— "

ہندو بہنیں اور بیٹیاں جب ہاتھ باندھ کر مولانا کی نعش کو پرنام کرتی تھیں تو حرم کی پیشانی پر کچھ بے عنوان سے قطرے جھلک اٹھتے تھے۔ مولانا تاریخِ انسانی کے تنہا مسلمان تھے۔ جن کے ماتم میں کعبہ و بت خانہ اس شدّت سے سینہ کوب تھے۔

جنازہ اٹھتا ہے

پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گریہ تھے۔ انہیں سنبھالنے والے ہزار دل تھے لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لئے دوڑتے پھر رہے تھے۔ تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے۔ لیکن لوگ دروازہ پر اندر آنے کو ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضاکار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے ——— رُک جاؤ ——— کہاں جاتے ہو؟ مولانا آرہے ہیں۔ مولانا جارہے ہیں۔ اور جب جنازہ اٹھانے کے لیئے انہیں بلایا گیا تو اُن کی نظر ہر کاب سیکورٹی آفیسر ولسا پر رُک گئی۔

"آپ کون؟"

"سیکورٹی آفیسر۔"

"کیوں؟"

"آپ کی حفاظت کے لیے۔"

کیسی حفاظت؟ ——— موت تو اپنے وقت پر آتی ہے بچا

کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا:

اس کی موت پر دس سال میں پہلی دفعہ تکبیر کے لیئے مسلمانوں کے گلے کھلے ہیں ۔۔۔۔

مرکر بھی مسلمانوں کو زندگی دے گیا ہے ۔۔۔؟

تمام تعالیوں پر آنسو جھار رہے تھے مقبرے کے ایک طرف علماء و حفاظ، قرآن پڑھ رہے تھے ۔۔۔ دوسری طرف اکابر و فضلاء سر جھکائے کھڑے تھے ۔ یہاں سب سے پہلے بری فوج کے ایک ہزار سپاہیوں ہوائی فوج کے تین سو جانبازوں اور بحری فوج کے پانچ سو جوانوں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ میت کو آخری سلام کیا ۔

پھر مولانا احمد سعید دہلوی صدر جمعیتہ العلمائے ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی ۔۔۔۔

ادھر نماز جنازہ پڑھی جا رہی تھی ۔ ادھر پنڈت نہرو قبر سے قریب فرش زمین پر بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے ۔۔۔!

امام نے السلام علیکم و رحمتہ اللہ کہا ۔ تو قلعہ اور مسجد کا قلب ایک دفعہ پھر اللہ اکبر کی صداؤں سے معمور ہو گیا ۔ اور جب میت لحد سے قریب لائی گئی ۔ تو ہزارہا ہندو اور سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے ۔ فوج نے تعزیتی بگل بجائے ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں نے بیک زبان اللہ کے ایک اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے کا اقرار کیا ۔

مولانا احمد سعید نے لحد میں اتارا ۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالے کر دیا گیا ۔

؎ ۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سبیل میں بھگو کر پھول نچھاور کیئے ۔

ـــــ ان کے پیچھے، جنرل شاہ نواز، اور دھیبر کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے ــــــ

جسم پر کھدر کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی۔ جس پر کشمیری شال پڑا تھا ـــ روزنامہ "تیج" دہلی کی روایت کے مطابق جنازہ پر غلافِ کعبہ پڑا تھا ــــ

کوٹھی کے دروازہ تک چارپائی کو کندھوں پر لایا گیا۔ جنازہ گاڑی کے پیچھے صدر جمہوریہ اور نائب صدر جمہوریہ کار میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزراءِ اعظم، اکثر صوبائی گورنر، اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آرہے تھے تمام بھارتی افواج کے چیفس آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے ــــ جب جنازہ کا جلوس انڈیا گیٹ اور ہارڈنگ برج سے ہوتا ہوا لاکھوں انسانوں کی شر دھانجلی لئے دریا گنج کے علاقہ میں داخل ہوا۔ تو دونوں پہلو سڑک، درمیانی فٹ پاتھ اور دراز قد مکانوں کی چھتوں سے پھول ہی پھول برسنے لگے۔ اس پون میل کے علاقہ میں پھولوں اور پنکھڑیوں کی موسلادھار بارش کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اور جب جنازہ مسلمانوں کی آبادی، جامع مسجد کے قریب وجوار میں پہنچا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ جامع مسجد کی بالائی چھت سیڑھیوں کے لمبے سلسلے محرابوں کی پیوست زنجیریں، حجروں کی ہم آغوش صفیں، مکانوں کی منڈیریں، اور دوکانوں کے چھجے، انسانی سروں سے لدے پڑے تھے۔ یہاں پریڈ گراؤنڈ میں جہاں محتاط سے محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ اس شدت سے نعرہ ہائے تکبیر گونجنے لگے ــــ اور اس زور سے مولانا آزاد پائندہ باد۔ کی آوازیں اٹھیں کہ ــــ سرخ میناروں نے ایک دوسرے کے

جن لوگوں پر ہمارے علم و عمل اور فکر و نظر کی عمارتیں استوار ہیں اپنی حیات میں ان پر تبری کیا گیا ——— قید میں ڈالا گیا۔ زنجیریں پہنائی گئیں۔ لبسا اوقات وہ عوام کے سب و شتم اور خواص کے جور و ستم کی تاب نہ لاکر موت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے انہیں گور و کفن سے بھی محروم رکھا ——— غرض رسوائی و تشہیر کا تمام گرد و غبار، ان کی ہستی پر ڈالا گیا ——— مگر جب وقت نے کروٹ لی تو ان کی ذات سورج کی طرح ابھر کر سامنے آگئی اور تاریخ کی پیشانیاں ان کے آستانۂ عظمت پر ہمیشہ کے لئے جھک گئیں ——— مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ان ہیبتناک راستوں سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں وقت کی کوئی گالی نہ تھی۔ جو ایک زمانہ میں مسلمانوں نے ان کے خلاف استعمال نہ کی ہو۔ مگر وہ تحمل کے اعتبار سے پہاڑ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی صبر کیا ——— ان کی اور ابن تیمیہ کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ اور یہ مماثلت موت کے بعد بھی قائم نظر آتی ہے جس طرح ان کی رحلت پر زندگی کا کوئی شعبہ ماتم سے خالی نہ رہا تھا۔ اسی طرح مولانا کی وفات پر زندگی کا ہر شعبہ ماتم گسار ہے۔ جب تک حیات تھے وقت کی سیاسی مصلحتیں ان کے گریبان پر ہاتھ اٹھاتی تھیں آج اٹھ گئے ہیں تو مزار عوام و خواص کا مرجع ہے۔

مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا

حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری ..... مرحوم مولانا کے صبر کو صبر ایوب سے نسبت دیا کرتے ہیں۔ مولانا کے خلاف ہمیشہ ہی گز بھر کی زبانیں کھلتی رہیں لیکن آج تمام ہندوستان اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ مولانا ہندوستان کے دماغوں کا نچوڑ تھے۔ ان کا وجود بعض امور میں ہندوستانی کابینہ کے فیصلوں کا اساس لیس منظر تھا ——— اکثر

:: پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے۔ اکابر جمعیۃ نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے ——— فضا کے تعزیتی اندھیرے کو وقفہ وقفہ سے تکبیریں جھنجوڑ رہی تھیں۔ جہاں نظر اٹھتی کوئی نہ کوئی بزرگ چہرہ روتا نظر آتا۔ ڈاکٹر محمود کے بڑھاپے کی جوان چیخیں دور تک سنی جاتی تھیں۔ ہر شخص بیتاب تھا کہ مٹی دے لے ——— گئی رات تک ہزار ہا سوگوار لوگوں کا جمگھٹ رہا ——— پہلی اور دوسری ساری شبیں ان گنت لوگوں نے قبر ہی پر کاٹ دیں۔ ایک طرف کلام پاک تھا کہ لوگ پڑھ پڑھ کر انہیں بخش رہے تھے۔ دوسری طرف دہم وہاں تین دن رہے ہر وقت ایک میلہ سا نظر آرہا تھا۔ دن بھر ہندو سکھ عورتیں اور مرد آتے پھول چڑھاتے اور نمسکار کر کے چلے جاتے ——— لیکن

مسلمانوں اور نامسلمانوں میں غم کی مماثلت کے باوجود درد کا فرق تھا مسلمانوں کے چہرے پر ایک ہی سوال تھا۔

:- بعض زبان سے بولتے تھے ، اور

:- بہتوں کے چہرے پوچھتے تھے ——— "اب کیا ہوگا؟"

ہماری آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ مولانا دفن نہیں ہو رہے۔ ہندوستان کے بیمار کروڑ مسلمان دفن ہو رہے ہیں۔"

غمزدہ انسان

مسلمان کی عہد آفریں ہستیوں پر خود مسلمانوں کے ہاتھوں جو گزری اس سے تاریخ بھری پڑی ہے ہمیشہ تربت کی عظمت پر ان کی موت نے شہادت دی ہے۔ آج

اظہارِ عقیدت

مسز ارونا آصف علی

مولانا آزاد کی عظمت کو چند لفظوں میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی گونا گوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں کے لیے سرچشمۂ فیض تھی۔ جس کسی کو انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا اس کے لئے یہ ایک بھرپور تجربہ ثابت ہوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے فصیح بیاں وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی صبر و شکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور ترو تازہ کیا۔

اُن کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انہیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک اردو کی تاریخ

بڑے بڑے فیصلے ان کے مشورے سے طے پاتے وہی جواہر لال کی ضد پر قابو پا سکتے اور انہیں اپنی رائے پر چلا سکتے تھے۔

پنڈت نہرو نے صحیح کہا ہے کہ:

"اُن کی یاد میں سنگ و خشت کی عمارتیں بھی بن جائینگی اور اُن کے اٹھ جانے سے دل و دماغ پر جو صدمہ چھا رہا ہے۔ اس کی تیزی بھی رفتہ رفتہ گھٹ جائیگی لیکن سوچتا ہوں اب جب مجھے مشورہ لینے کی ضرورت ہوگی تو کس کے پاس جاؤنگا۔ جب کبھی ہمیں کٹھنائیں (دشواریاں) پیش آتی تھیں وہ تنہا تھے جو اس منجدھار سے ہمیں نکالا کرتے تھے۔"

مولانا کی قبر

راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔ دونوں کا سیاسی میدان ہمیشہ ہی مختلف رہا۔ لیکن عوام کی بھیڑ سے کنارہ کیا، اقبال کو شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی —— کہ سامنے قلعہ شاہی اور وسط میں حضوری باغ ہے۔ ابوالکلام جامع مسجد و لال قلعہ کے درمیان، قلب ہی جگہ ملی کہ مولانا دونوں عمارتوں کے شکوہ کی انسانی تصویر تھے۔ ابوالکلام کی ادبی وجاہت کا پہلا نقش سرمد شہید پر ان کا مقالہ تھا۔ اور یہ اتفاق بھی عجیب ہے کہ مزار سرمد سے قریب ہی مولانا کی تدفین ہوئی ہے یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر دو قبریں اور ہیں ایک مزار سرمد کے پہلو میں انکے مرشد ہرے بھرے صاحب کا مزار ہے دوسری اردو بازار کو نکلتی ہوئی سڑک پر مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور کی قبر ہے۔

ہائے شوکت تجھے موت ہی آئی ہوتی۔

کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مورخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہوجائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تین شخصیتیں ہندوستانیوں کی نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوتِ تاثیر اس بات میں مضمر ہے کہ یہ عقل و کردار کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ پُر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ برابر آئندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔